For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

نثر نگاروں پر تبصرہ

سرسید احمد خان

سرسید نے اردو ادب اور اس کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے وہ ایک دبستان ایک تحریک ایک ادارے کی سی حیثیت رکھتے ہیں انھوں نے اردو نثر کو سلاست اور روانی کے زیور سے آراستہ کر کے اسے قومی مقاصد کے حصول اور اشاعت کا ذریعہ بنایا ہے انھوں نے ادب، تاریخ، مذہب، سیاست اور تہذیب وتمدن پر ایسے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں جو ہر منزل پر ان کی یاد دلاتے رہیں گے انھیں بجا طور پر اردو نثر کا مورث اعلیٰ کہا گیا ہے۔

طرز تحریر کی خصوصیات

(۱) سادگی: سرسید سے پہلے اردو نثر تکلف اور تصنع کا شکار تھی مواد کے بجائے الفاظ کو اہمیت دی جاتی تھی سرسید نے اس انداز کو مسترد کر کے سادگی اور سلاست کی روش اختیار کی اور ایسی نثر لکھی جو ان کے بقول "دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے" اس معاملے میں وہ انگریزی ادیبوں ایڈیسن اور اسٹیل سے متاثر نظر آتے ہیں انھوں نے اردو نثر کو ہر قسم کی لفظی بازی گری سے پاک کر کے ہر قسم کے مسائل کو عام فہم اور سلیس انداز میں پیش کیا۔

(۲) مقصدیت: سرسید نے جو کچھ لکھا کسی نہ کسی اصلاحی مقصد کے تحت لکھا اس لیے انھوں نے عبادت آرائی اور حسن بیان کی طرف توجہ نہیں دی بلکہ مدعا نگاری اور مواد کی طرف ان کا خیال زیادہ رہا وہ مصلح پہلے تھے اور ادیب بعد میں۔ انھوں نے اپنی نثر سے قومی اصلاح کا کام لیا ہے ان کے رسالے تہذیب الاخلاق کے تمام مضامین میں مقصدی اور تبلیغی رنگ پایا جاتا ہے۔

(۳) بے ساختگی: سرسید کے جس وصف کو حالی نے بے ساختگی کے نام سے یاد کیا ہے وہ حالی اور شبلی کی سی بے ساختگی نہیں، بلکہ ان معنوں میں ہے کہ وہ لکھتے ہوئے زبان و بیان کے قواعد کو نظر انداز کر دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ادبی حسن کی کمی ہے۔

(۴) استدلالیت: سرسید کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت ان کا منطقی انداز ہے وہ اپنی تحریروں میں زور پیدا کرنے کے لیے جذبات کے بجائے دلائل کا سہارا لیتے ہیں اسی لیے ان کی تحریریں جذبات کے بجائے عقل کو زیادہ متاثر کرتی ہیں۔

(۵) سنجیدگی اور متانت: سرسید کی تحریریں سنجیدہ ہوتی ہیں ان کا انداز بیان اگرچہ عام فہم ہے اور زبان بھی بڑی سادہ استعمال کرتے ہیں مگر موضوع کی سنجیدگی اور تحریر کی متانت سے شگفتگی پیدا نہیں ہوتی۔

(۶) انشائیت: اگرچہ سرسید کی تحریروں میں عام طور پر منطق اور استدلال کا رنگ غالب ہے لیکن انھوں نے ایسے مضامین بھی تحریر کیے ہیں جن میں استدلال کے بجائے تمثیل، تخیل اور جذبات کی کرم فرمائی ہے مثلاً گزرا ہوا زمانہ، بحث و تکرار اور تعصب وغیرہ یہ مضامین دراصل انشائیے ہیں اسی لیے سرسید کو اردو کا پہلا انشائیہ نگار بھی کہا جاتا ہے۔

(۷) تراکیب کا بھدا پن: سرسید عام فہم اور بول چال کے انداز میں لکھنے کے شوق میں اکثر اوقات بڑی بھدی ترکیبیں استعمال کر جاتے ہیں جو اپنے عامیانہ پن کی وجہ سے ذوقِ سلیم پر گراں گذرتی ہیں۔

(۸) انگریزی الفاظ کا بے جا استعمال: سرسید انگریزی الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں خاص طور پر ایسے الفاظ، جن کا آسان متبادل اردو میں موجود بھی ہوتا ہے، کا استعمال بہت ناگوار محسوس ہوتا ہے۔

(۹) ظرافت: سرسید غالب کو چچا کہتے تھے شاید اسی وجہ سے کہیں کہیں ان کی تحریروں میں ظرافت اور مزاح بھی ملتا ہے بعض اوقات یہ مزاح طنز کی صورت اختیار کر لیتا ہے خاص طور پر اپنے مخالفین کے بارے میں ان کا انداز شدید طنزیہ بھی ہو جاتا ہے۔

(۱۰) مقالہ نگاری: اردو ادب میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے فن مقالہ نگاری کی ابتدا کی اگرچہ سرسید سے پہلے بعض اخباروں اور رسالوں میں اخلاقی اور مذہبی مقالے شائع ہو چکے تھے لیکن ایک تو ان کا موضوع محدود تھا دوسرے اپنی مشکل زبان کی وجہ سے وہ مقالے کی صحیح تعریف پر پورے نہیں اترتے تھے۔ سرسید نے نئے نئے موضوعات پر قلم اُٹھایا اور صاف صاف اور سادہ زبان میں مقالے لکھے۔

(۱۱) موضوعات کی وسعت: سرسید نے اردو نثر کو نئے نئے موضوعات دیے اور ہر قسم کے علمی، اخلاقی، اصلاحی، مذہبی، تہذیبی اور معاشرتی مضامین لکھ کر اردو زبان کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کر دیا اور مستقبل کے انشاء پردازوں کو ایک نیا راستہ دکھایا یہی وجہ ہے کہ انہیں اردو نثر کا مورثِ اعلیٰ کہا جاتا ہے۔

(۱۲) قدرت بیان: علمی مضامین کو بیان کرنے کے لیے جو انداز اختیار کیا جاتا ہے وہ عموماً مشکل ہوتا ہے کیونکہ پیچیدہ علمی مسائل کے لیے استعمال ہونے والی زبان اصطلاحوں کی وجہ سے دشوار اور خشک ہو جاتی ہے مگر سرسید کا بڑا کمال یہ ہے کہ علمی مسائل کو بھی محض اپنی قدرت بیان کی وجہ سے عام فہم اور سادہ انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔

(۱۳) ناقدین کی آراء:

شبلی لکھتے ہیں "جو چیزیں ان کی اصلاح کی بدولت ذرے سے آفتاب بن گئیں ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے"۔

مہدی افاری کا کہنا ہے "تمام نئی نسل تہذیب الاخلاق کی پروردہ ہے"۔

حالی لکھتے ہیں "سرسید کی تحریر میں موجود تاثر درحقیقت ان کی سچائی اور سادگی کی وجہ سے ہے"۔

مولوی عبدالحق کا کہنا ہے "یہ سرسید ہی کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اردو ادب کو ایک قلیل عرصے میں کہاں سے کہاں پہنچا دیا"۔

حرفِ آخر:

حرفِ آخر کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرسید کا اسلوب سادگی، مقصدیت اور بے ساختگی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے وہ پہلے نثر نگار ہیں جو انگریزی سے متاثر ہیں اور اسی کی تقلید میں انہوں نے برصغیر میں اصلاحی تحریک شروع کی جو جدید نسل کی کایا پلٹنے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے ان کی اصلاحی تحریک نے حالی، شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد جیسے لوگ پیدا کیے جنھوں نے اردو نثر کو مالا مال کر دیا سرسید نے صرف زبان و بیان کے اعتبار سے ہی اردو ادب کو متاثر نہیں کیا بلکہ اسے نئے نئے موضوعات سے بھی روشناس کرایا ہے اسی لیے مہدی افادی کے بقول "سرسید کے کمالاتِ ادبی کا اعتراف نہ کرنا صرف ناشکری ہی نہیں بلکہ تاریخی غلطی ہے"۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

غالب ۔۔ نثر نگاری

مرزا اسد اللہ خان غالب نے جس طرح اردو شاعری میں ایک منفرد انداز اختیار کیا اسی طرح وہ اردو نثر میں بھی ایک خاص طرز کے موجد ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے خطوط کے مجموعے "عود ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" کی اشاعت کو جدید اردو نثر کا باقاعدہ منشور تسلیم کیا گیا ہے۔ غالب نے ۱۸۵۰ء سے اردو میں خطوط لکھنے شروع کیے اس سے پہلے وہ فارسی میں بہت اہتمام سے خطوط لکھا کرتے تھے لیکن ان کے اردو خطوط نے جدید اردو نثر کی بنیاد ڈالی اور قدیم طرز کی پر تکلف مکتوب نگاری تھوڑے ہی عرصے میں بالکل ختم ہوگئی۔

غالب نے اپنے خطوط میں بے تکلفی کا جو انداز اپنایا اس کی تقلید نہ کوئی کر سکا اور نہ کر سکے گا۔

خطوط غالب کی خصوصات

(۱) القاب وآداب کا خاتمہ: غالب سے پہلے خط وکتابت میں القاب وآداب بڑے اہتمام سے لکھے جاتے تھے جن میں تصنع پایا جاتا تھا غالب نے وہ طریقہ بالکل ترک کر دیا وہ خط کو کبھی میاں صاحب، بھائی صاحب وغیرہ کے الفاظ سے شروع کرتے ہیں اور بعض خطوں میں تو سرے سے القاب ہی نہیں مثلاً میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں۔ "مرد مہدی تم میری عادت بھول گئے ماہ رمضان میں کبھی جامع مسجد کی تراویح ناغہ ہوئی ہے"؟

(۲) مراسلے مں ومکالمہ: دہلی اجڑ جانے کے بعد غالب ایک قسم کی قید تنہائی میں تھے اس لیے شعوری طور پر انھوں نے خطوط کے ذریعے مجلسی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی اور ایسا انداز اپنایا جو تحریر کو گفتگو بنادے خود لکھتے ہیں" میں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو، ان خطوط کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دو دوست آپس میں بیٹھے ہوئے بات چیت کر رہے ہیں۔

(۳) منظر نگاری: غالب خط لکھتے وقت مکتوب الیہ کے لیے بھی مجلس فضا تخلیق کر سکتے ہیں اور اپنے گرد وپیش کے منظر کی ایسی تفصیلپیشکرتے ہیں کہ تصویر سی کھینچ کر رکھ دیتے ہیں مثلاً میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں" صبح کا وقت ہے جاڑا خوب پڑ رہا ہے انگیٹھی سامنے رکھیے دو حرف لکھتا ہوں ہاتھ تاپتا جاتا ہوں"۔

(۴) شوخی وظرافت: حالی نے غالب کو حیوان ظریف اس لیے کہا ہے کہ وہ زندگی کی تمام تلخیوں کے باوجود زندگی سے پیار کرتے تھے وہ اپنی تکلیف کا بیان بھی شوخی سے کرتے ہیں ایک خط میں بارش کی تکالیف کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔" تین مہینے سے کشتی نوح میں قیاہے یہ کرائے کی حویلی ہے جس میں رہتا ہوں چھت چھلنی ہوگئی ہے ابر دو گھنٹے برستا ہے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے"۔

(۵) سادگی اور بے تکلفی: غالب سے پہلے اردو نثر کا انداز بڑا پر تکلف تھا اور زیادہ سے زیادہ مشکل اور پیچیدہ زبان لکھنا قابلیت کی نشانی سمجھی جاتی تھی مگر غالب نے جو خطوط لکھے وہ سادہ اور بے تکلف تھے انہوں نے عام فہم زبان لکھ کر اردو نثر کو ایک نئی راہ دکھائی۔ سرسید تحریک کے زیر اثر جب آسان سادہ اور رواں نثر نگاری پر زور دیا گیا تو سرسید اور ان کے ساتھیوں کی رہنمائی کرنے والے یہی خطوط تھے۔

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

(۶) آپ بیتی: غالب نے اپنے خطوط میں آپ بیتی کے انداز میں اپنی زندگی کے بہت سے گوشوں سے پردہ اٹھایا ہے اور اپنی سرگزشت کے بہت سے اوراق بیان کر دیے ہیں ان خطوط میں غالب کی مے نوشی اور قمار بازی سے لے کر ان کے نفسیاتی رجحانات اور ان کی مالی مشکلات تک سب کا ذکر موجود ہے جس سے غالب کا ظاہر و باطن سب سامنے آ جاتا ہے اگر غالب کے خطوط سے اس مواد کو اکٹھا کر کے ترتیب دیا جائے تو ایک خوبصورت آپ بیتی مرتب ہو سکتی ہے۔

(۷) معاشرے کی عکاسی: غالب کے خطوں میں اپنے عہد کی معاشرت کی تصویر صاف دکھائی دیتی ہے انہوں نے دلی کے اجڑنے مسلمانوں کے نکالے جانے اور لوگوں کے پھانسی پانے کے حالات کو بڑی خوبی سے قلم بند کیا ہے اپنے دور کی مشہور شخصیات کا ذکر کسی نہ کسی حوالے سے ان کے خطوط میں موجود ہے نیز زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے رہن سہن میں تبدیلیوں کا نقشہ بھی کھینچا ہے اور لوگوں کی محرومیوں اور مجبوریوں کی عکاسی بھی کی ہے۔

(۸) ادبی اور تاریخی حیثیت: غالب کے خطوط کی ادبی اور تاریخی حیثیت بھی ہے ان میں ہم عصر شاعروں کی شاعری پر تبصرہ بھی ہے اور شعر اور اس کے فنی محاسن کے بارے میں ان کے خیالات بھی نیز تہذیب مغلیہ کے زوال کی داستان ان کے خطوط میں جا بجا موجود ہے غالب چونکہ آخری مغل بادشاہ بہادر ظفر کے استاد بھی تھے اس لیے مغلیہ دربار اور اس کے ماحول کی منظر کشی بھی ان کے خطوں میں موجود ہے۔

(۹) اشعار کی تشریح: غالب نے اکثر خطوط اپنے شاگردوں کو لکھے ہیں اور شاگردوں کے کام کی اصلاح کے دوران انھوں نے خود اپنے بہت اشعار کی تشریح اپنے خطوط میں کی ہے غالب کے کئی اشعار تو ایسے ہیں کہ ان کا مطلب ان کے خطوط کے سیاق و سباق کی روشنی میں ہی سمجھا جا سکتا ہے اور غالب کے کلام کا کوئی بھی شارح ان کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

(۱۰) ایجاز و اختصار: غالب اپنے خطوط میں ایجاز و اختصار سے کام لینے کے عادی ہیں وہ ضروری باتیں لکھ کر باقی باتیں کسی اور موقع کے لیے چھوڑ دیتے ہیں مگر اس اختصار کے ساتھ ساتھ وہ جہاں ضرورت ہو ضروری تفاصیل سے بھی قاری کو آگاہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے ہر چیز زندہ اور متحرک نظر آتی ہے۔

(۱۱) ناقدین کی آراء:

رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں "حقیقت یہ ہے کہ وہ فارسی اور اردو دونوں کے بے مثل نثار بھی اسی طرح ہیں جس طرح کے بے نظیر و بے بدل شاعر ہیں"۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کہتے ہیں "خطوط غالب کو اردو کے بنیادی اسالیب میں سے ایک نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے"۔

حامد حسین قادری لکھتے ہیں "اردو خطوط نویسی میں غالب نے جو طریقہ اختیار کیا اس میں وہ اول بھی ہیں اور آخر بھی"۔

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب کے خطوط جدید نثر کا نقطۂ آغاز ہیں ان کے خطوط صرف ان کی ذاتی زندگی بلکہ اس وقت کی دلی کی تہذیب و معاشرت اور سیاسی حالات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں ان خطوط کی سادگی شگفتگی اور روانی نے اردو نثر کو ایک نئی راہ سے روشناس کرایا ہے خطوط غالب اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

خواجہ الطاف حسین حالی

شاعر سوانح نگار اور مقالہ نگار خواجہ الطاف حسین حالی کو اردو کا پہلا باقاعدہ نقاد تسلیم کیا گیا ہے اردو ادب میں ان سے پہلے تنقیدی شعور موجود تو تھا مگر وہ تنقید ذاتی پسند اور ناپسند کا کرشمہ تھی اور تنقید کے باقاعدہ اصول موجود نہیں تھے حالی نے تنقید پر "مقدمہ شعر و شاعری" کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا جس کی بنا پر انھیں جدید اردو تنقید کا بانی اور پہلا باقاعدہ تنقید نگار کہا جاتا ہے۔

طرزِ تحریر کی خصوصیات

۱۔ سرسید کے اثرات: سرسید کے بعد اگر کسی نے ان کے رنگ میں ڈھلنے کی کوشش کی تو وہ حالی ہیں ان کے اکثر خیالات سرسید کی بازگشت معلوم ہوتے ہیں تحریر میں انھوں نے سرسید کا ترغیبی انداز اور تلقینی اسلوب اپنایا وہی سرسید کی طرح منطقی انداز اور اظہار بیان میں بے تکلفی اور وہی عقل پسندی کا رجحان حالی کے ہاں بھی ملتا ہے۔

(۲) سادگی: حالی کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی سادگی ہے ان کی نثر رواں اور سلیس ہے وہ الفاظ کی پیچیدگیوں میں الجھنے سے گریز کرتے ہیں اور اپنا مدعا سیدھے سادے انداز میں بیان کرتے ہیں اور لفظی صناعی سے اپنا دامن بچا کر گزرتے ہیں۔

(۳) مقصدیت: حالی سرسید کے سب سے قریبی ساتھی ہیں اور ادب برائے زندگی کے قائل ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر پر مقصدیت کا گہرا اثر ہے مگر انہوں نے مقصدیت کے جوش میں ڈپٹی نذیر احمد کی طرح فن کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا اور نثر کو وعظ نہیں بنایا۔

(۴) استدلالی انداز: حالی کا انداز استدلالی ہے وہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے دلائل اور شواہد کو اس خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں کہ قاری ان کے نقطۂ نظر کا قائل ہو جاتا ہے ان کی تحریریں منطقی اعتبار سے مضبوط ہوتی ہیں وہ جو کچھ لکھتے ہیں اوہ مدلل ہوتا ہے۔

(۵) اعتدال اور توازن: حالی ایک متین اور سنجیدہ انسان تھے یہی سنجیدگی اور متانت ان کی تحریروں میں ملتی ہے وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں انتہائی احتیاط اور ذمے داری سے لکھتے ہیں اس لیے ان کی تحریر میں جوش کی کمی تو ہے لیکن توازن اور اعتدال کی وجہ سے ان کی تحریر میں ایک خاص قسم کا وقار پیدا ہوگیا ہے۔

(۶) قومی درد: حالی ایک دردمند دل کے مالک تھے جسے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے اور مسلم معاشرے کی پسماندگی اور رسوائی نے مزید دردمند بنا دیا تھا مسلمانوں کے لیے ان کا دل کڑھتا رہتا تھا یہی وجہ ہے کہ نظم ہو یا نثر دونوں میں ان کے دل کا درد نوکِ قلم پر آ گیا ہے خاص طور پر سرسید سے وابستہ ہونے کے بعد یہ رنگ بہت نمایاں ہے۔

(۷) مدعا نگاری: حالی کی تحریروں میں آزاد کی طرح شان و شوکت اور رنگینی نہیں ہوتی وہ بات کو گھما پھرا کر نہیں کہتے بلکہ صاف اور واضح الفاظ میں اپنا مقصد بیان کرتے ہیں ان کی نظر ہر وقت مقصد اور مطلب پر رہتی ہے وہ خیالی دنیا میں پرواز نہیں کرتے بلکہ حقیقی دنیا میں ہی رہنا پسند کرتے ہیں ان کی کوشش ہوتی ہے کہ پڑھنے والا ان کی بات کو فوراً سمجھ جائے۔

(۸) خلوص اور سچائی: حالی کی تحریر میں اثر و تاثیر کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کے خیالات میں خلوص اور سچائی ہے یعنی بات دل سے

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

نکلتی ہے اور سیدھی دل میں اترتی ہے حالی کی تحریر پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والا جو کچھ بھی لکھ رہا ہے کسی جذبے کے تحت پورے خلوص سے لکھ رہا ہے ان کی تحریر میں جہاں سچائی نظر آتی ہے وہیں عظمت بھی پائی جاتی ہے کیونکہ حالی تکلف اور تصنع سے کوسوں دور ہیں۔

(۹) انگریزی الفاظ کا استعمال: سرسید اور ان کے رفقاء نے شعوری اور لاشعوری طور پر اپنی تحریروں میں انگریزی الفاظ کا استعمال کیا ہے حالی بھی مغربی شعراء ادباء کے حوالے اور انگریزی الفاظ کا جا بجا استعمال کرتے ہیں اگرچہ یہ عیب حالی میں سرسید سے پھر بھی کم ہے۔

(۱۰) بے ساختگی: حالی کا اسلوب بے ساختہ اور بے تکلف ہے وہ بالکل فطری انداز میں اپنے دل کی بات لکھتے چلے جاتے ہیں بناوٹ ان کی تحریر میں کہیں نہیں ملتی اگرچہ انھوں نے سرسید کی طرح زبان کو نظر انداز نہیں کیا تاہم وہ عبارت آرائی پر زیادہ توجہ نہیں دیتے اور بے تکلفی اور بے ساختگی سے اپنا مطلب بیان کرتے ہیں۔

(۱۱) ناقدین کی آراء:

"انیسویں صدی میں کسی شخص نے ہماری زبان وادب پر ایسے گراں قدر احسانات نہیں کیے جتنے حالی نے۔ وہ ہماری جدید شاعری کے امام اور مجتہد ہیں۔" (مولوی عبدالحق)

"حالی نے ایسا پرسوز راگ الاپا جسے سن کر خوابیدہ قوم چونک پڑی"۔ (آل احمد سرور)

"حالی کا نام ان کی قومی شاعری کی بدولت ہمیشہ زندہ رہے گا"۔ (احتشام حسین)

"سرسید اور حالی نے شعوری طور پر ادب وسماج کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کی اور یہیں سے جدید اردو ادب کا آغاز ہوتا ہے"۔ (سردار جعفری)

"بیان کی سادگی اور صفائی، زبان کی سلاست ونرمی اور گھلاوٹ حالی کا حصہ ہے"۔ (عابد حسین)

حرف آخر: حالی کو اردو ادب میں کئی چیزوں میں اولیت حاصل ہے وہ نہ صرف باقاعدہ قومی شاعری کے بانی ہیں بلکہ جدید اور سائنسی انداز سے لکھی گئی سوانح عمریوں کا آغاز بھی ان سے ہی ہوا حیات جاوید، یادگار غالب اور حیات سعدی اس کی روشن مثالیں ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ انہوں نے تنقید پر مقدمہ شعروشاعری لکھ کر اردو میں باقاعدہ تنقید نگاری کا آغاز کیا اور آج جب کہ تنقید نگاری کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے ہر نقاد ان کے تنقیدی شعور سے فائدہ اٹھانے پر مجبور ہے اسی لیے ڈاکٹر عبادت بریلوی حالی کو اردو کا سب سے بڑا نقاد مانتے ہیں مولوی عبدالحق برملا فرماتے تھے کہ انسویں صدی میں اردو زبان وادب پر حالی سے زیادہ کسی کے احسانات نہیں ہیں۔

خواجہ حسن نظامی

علی حسن نام تھا حضرت نظام الدین اولیاء سے نسبت کی وجہ سے نظامی مشہور ہوئے۔ بہت چھوٹی عمر سے لکھنے لکھانے کی ابتدا کی ان کی پہلی کتاب "مفلسی کا مجرب علاج" ہے۔ لیکن ان کی شہرت کا آغاز ۱۹۱۱ء میں ان کے "مصر، شام اور حجاز کے سفرنامے" سے ہوا، اس سفرنامے کے دلکش طرز نگارش نے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا آپ نے انشائیے لکھے، افسانے لکھے، صحافت کی لیکن آپ کی شہرت آپ کی شاندار اسلوب کی بدولت ہے۔ ایسا اسلوب جس میں سادگی کے باوجود ایسی ادبیت ہے کہ پڑھنے والا محوحیرت ہوجاتا ہے۔

طرزِ تحریر کی خصوصیات

(۱) سادگی: حسن نظامی کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت اس کی سادگی و پرکاری ہے۔ان سے پہلے عربی اور فارسی الفاظ کی زیادہ سے زیادہ شمولیت کو معیاری انشاء پردازی سمجھا جاتا تھا حسن نظامی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے سادہ سلیس اور ہندی آمیز زبان میں ایسے مضامین لکھے کہ تمام ادیبوں نے انہیں منفرد انشاء پرداز تسلیم کیا۔

(۲) شگفتگی: وہ بنیادی طور پر انشائیہ نگار ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر شگفتہ اور تروتازہ ہوتی ہے وہ معمولی باتوں کو بھی اپنے شگفتہ انداز بیان سے دلچسپ بنا دیتے ہیں۔خواجہ صاحب نے اپنی بیوی کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں بھی جو القاب اپنی بیگمکے استعمال کیے ہیں وہ ان کی شوخی طبع کی دلیل ہیں۔

(۳) ٹکسالی زبان: خواجہ صاحب دہلی میں پیدا ہوئے۔وہیں پروان چڑھے اس لیے ان کی تحریروں کی زبان خالص دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔وہ اہل زبان کے روزمرہ اور محاورے کو بڑی بے ساختگی کے ساتھ اپنی تحریر میں استعمال کرتے ہیں اسلیے بابائے اردو کہا کرتے تھے"اگر تم ستھری اور نکھری ہوئی اردو پڑھنا اور سیکھنا چاہو تو خواجہ صاحب کی تحریر پڑھو"۔

(۴) ظرافت: خواجہ صاحب کی تحریریں صرف سنجیدہ اور متین ہی نہیں بلکہ ان میٹھی سی ظرافت کی بھی آمیزش ہے جو پڑھنے والے کو تھوڑی دیر کے لیے فرحت سے روشناس کرا دیتی ہے۔

(۵) جدت پسندی: وہ اپنی جدت پسندی کے لیے مشہور ہیں ان کی تحریروں اور خاص طور پر ان کے مضامین کے عنوانات تو بہت ہی انوکھے ہوتے ہیں۔مثلاً "مچھر کا اعلان جنگ"، "جھینگر کا جنازہ"، "فرام قبلہ ٹو شملہ" وغیرہ وغیرہ۔

(۶) جذبات نگاری: خواجہ صاحب کو جذبات نگاری پر بڑی قدرت حاصل ہے۔وہ تخیل کی رنگ آمیزی کیے بغیر مختلف جذبات و احساسات کی بڑی کامیاب منظر کشی کرتے ہیں"غدر دہلی کے افسانے" نامی کتاب میں ان کی جذبات نگاری عروج پر ہے۔انھوں نے شاہی خاندان کی تباہی اور بربادی کا حال اور ان کے جذبات کی بڑی کامیاب ترجمانی ہے۔خواجہ صاحب کی اسی فطری جذبات نگاری کی وجہ سے انھیں"مصورِ فطرت" بھی کہا جاتا ہے۔

(۷) منظر نگاری: خواجہ صاحب ماحول کی تصویر انتہائی مؤثر اور واضح انداز میں کھینچتے ہیں۔ان کو جتنی قدرت اپنی زبان پر حاصل ہے اتنی ہی قدرت فطری مناظر کے بیان میں ہے وہ ایک مصور کی طرح کسی بھی منظر کی ہو بہو تصویر الفاظ میں پیش کر دیتے ہیں اور منظر کا گوشہ گوشہ ہماری نگاہوں کے سامنے عیاں ہو جاتا ہے۔

(۸) مشاہدے کی گہرائی: خواجہ صاحب کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ان کی نظر اردگرد کے ماحول کی ہر چیز پر پڑتی ہے عام انسان جن چیزوں کو ذرا بھی اہمیت نہیں دیتا وہ اس کا بھی بغور مطالعہ کرتے ہیں اور معمولی سی بات کو اپنے دلکش انداز سے غیر معمولی بنا دیتے ہیں ایسی ایسی چیز جن پر چند جملے لکھنا بھی محال ہوں ان پر پورے پورے مضمون لکھ دیتے ہیں مثلاً دیا سلائی، مچھر، جھینگر وغیرہ۔

(۹) اختصار پسندی: خواجہ حسن نظامی کے جملے ہلکے اور مختصر ہوتے ہیں وہ بلاوجہ بات کو طول نہیں دیتے اور انشاء پردازی کے زور

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

میں مشکل تراکیب استعمال بالکل نہیں کرتے۔ اضافت کا استعمال بھی بہت کم کرتے ہیں اسی طرح ان کے مضامین کے عنوان بھی مختصر ہوتے ہیں مثلاً مچھر، الو، لالٹین، مکھی وغیرہ۔

(۱۰) تنوع: خواجہ صاحب نے کسی ایک موضوع پر نہیں لکھا بلکہ ان کے موضاعات میں عجیب وغریب تنوع پایا جاتا ہے وہ تاریخ، ادب، اخلاق، سیاست، مذہب، تصوف وغیرہ پر بے تکلف لکھتے چلے جاتے ہیں اس دور کے اخبارات اور رسائل میں جب ان کے مضامین چھپتے تو اپنے شاندار اسلوب کی وجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔

(۱۱) شاہی خاندان کی بربادی کی دردناک عکاسی: خواجہ حسن نظامی نے اپنی کتاب "غدر دہلی کے افسانے" میں مغلیہ خاندان کے شہزادوں اور شہزادیوں کی بے کسی اور بے چارگی پر روشنی ڈالی ہے اور ان کے المناک واقعات کو تڑپا دینے والے انداز میں بیان کیا ہے۔ کئی مقامات پر آنسو روکنے مشکل ہو جاتے ہیں ان کے لہجے کا سوز وگداز ایسا ہے اور اس میں ایسی چبھن ہے جو ہمیں سوائے "راشد الخیری" کے کسی اور کے ہاں نظر نہیں آتی۔

(۱۲) صوفیانہ رنگ: صوفی ہونے کی وجہ سے آپ کی تحریروں میں بھی صوفیانہ رنگ نظر آتا ہے۔ صوفیانہ خیالات کے اظہار میں آپ کے انداز میں ایک خاص قسم کی والہیت، ترنم اور جوش پیدا ہوجاتا ہے۔ مثلاً "من کہ ایک دھوبی" کا اقتباس ہے۔

"کیوں رے چولے کاٹوں تیرا میل، پانی ابلا، جوش میں آیا، توگھبرایا، ملی کٹا، پاک ہوا، صاف ہوا، اب کیسی سی سی آہ! چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو۔"

ناقدین کی آرا:

"خواجہ صاحب کو سرخیاں تلاش کرنے میں بے حد مہارت ہے اور ان کے افسانوں کی بڑی دلکشی ان سرخیوں کے علاوہ ان کے طرز بیان اور زبان میں ہے"۔ (وقار عظیم)

"خواجہ صاحب معمولی معمولی مضامین اور خیالات کو نہایت دلکش اور موثر طریقے سے ادا کرسکتے ہیں اور الفاظ نئے نئے اور عجیب وضع کرتے ہیں"۔ (رام بابو سکسینہ)

حرف آخر: ہم کہہ سکتے ہیں کہ خواجہ حسن نظامی اردو کے بلند پایہ انشائیہ نگار ہیں۔ آپ کی نثر سادگی، رنگینی اور شگفتگی کا حسین مرقع ہے۔ جس میں فارسی سے زیادہ ہندی کے میٹھے میٹھے الفاظ کی آمیزش ہوتی ہے جسے بعد میں "ملا رموزی" نے "گلابی اردو" کے نام سے آگے بڑھایا لیکن بعد کے لکھنے والوں میں کوئی بھی خواجہ صاحب کی قدرت بیان اور ذہانت کے معیار تک نہیں پہنچ سکا اسی لیے علامہ اقبال نے کہا تھا۔ "میں شعر موزوں کرنا چھوڑ دیتا اگر حسن نظامی کی سی نثر لکھنے پر مجھ کو قدرت حاصل ہوتی۔"

منشی پریم چند

منشی پریم چند (دھنپت رائے) ۱۸۸۰ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام منشی عجائب لال تھا۔ فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بنارس کے ایک اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور محکمہ تعلیم میں ملازم ہوگئے۔ درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ آپ نے بی

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

۔اے پاس کیا۔ ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۰۱ء سے ہوا، جب آپ نے رسالہ زمانہ کے لیے مضامین لکھنے شروع کیے۔ ۱۹۰۴ء میں ہندی ناول "پریما" لکھا۔ آپ نے ۱۹۰۵ء میں اپنا پہلا افسانہ "انمول رتن" لکھا۔ جسے اردو ادب کا پہلا افسانہ اور پریم چند کو اردو کا پہلا افسانہ نگار قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے افسانے "کفن" کو اردو کے چند بہترین افسانوں میں سے ایک خیال کیا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں حقیقت نگاری، اصلاح پسندی، خیر و شر کی باہم کشمکش نظر آتی ہے۔ پریم چند کے بیشتر افسانے دیہی پس منظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہلکے پھلکے مزاح سے بھرپور کہانیاں بھی لکھیں جو آپ کے افسانوں کے مجموعہ "واردات" میں شامل ہیں۔ پریم چند کا پہلا افسانوی مجموعہ "سوزِ وطن" کے نام سے شائع ہوا، اس کے علاوہ دیگر افسانوی مجموعوں میں "خواب و خیال، فردوس خیال، زادِ راہ" اہم ہیں۔ آپ کے ناولوں میں "بازارِ حسن"، میدانِ عمل، گئودان، غبن، چوگانِ ہستی اور بیوہ وغیرہ ہیں۔ آپ کا انتقال ۱۹۳۶ء میں بنارس میں ہوا۔

(۱) ابتدائی رنگ: پریم چند اردو افسانہ کے خالق ہیں۔ انھوں نے افسانہ کو جدید فن اور ٹیکنیک کے ساتھ برتا ہے۔ لیکن پریم چند کا ابتدائی رنگ خالص تصوراتی اور جذباتی ہے۔ وہ ایک ہی طبقے کی جوانمردی، بہادری، سچائی اور شان و شوکت کا ذکر کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ جلد ہی اس طلسم سے باہر آگئے۔ اور انھوں نے زندگی کو زندگی کی تفسیر بنا کر شہرت حاصل کی۔ ان کی زبان میں شعریت اور رنگینی ہے، ان کے افسانے "انمول رتن" میں یہی نقوش پائے جاتے ہیں۔

(۲) حقیقت نگاری: پریم چند کے ہاں زندگی کا واضح احساس موجود ہے۔ وہ سماجی حالات کا شعور رکھتے ہیں۔ وہ زندگی کے جس شعبے کا اظہار کرتے ہیں۔۔ وہ اپنے اصلی رنگ میں ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ پریم چند عوام کی روح میں اُتر کر ان کے درد و کرب، اضطراب و مایوسی اور ان کے خواب و خیال کو پڑھتے ہیں۔ وہ عوام کو اس بدحالی سے نکال کر بہتر زندگی دینا چاہتے ہیں، ان کا نظریہ ہے کہ اگر ادب انسانیت سے ہم آہنگ نہ ہو تو وہ ناکام اور نامراد رہے گا۔

(۳) قومی جذبہ: پریم چند کے افسانوں کی پہلی خصوصیت قومی جذبہ ہے۔ وہ اپنی قوم اور ملک کی ہر چیز کو عقیدت سے دیکھتے ہیں جو اسے دوسری قوموں کے سامنے ممتاز کرتی ہے۔ انھوں نے مستقبل کے خواب تو ضرور دیکھے مگر اپنے ماضی کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ ان کو پرانی عظمتوں کا شدید احساس ہے۔ وطن پرستی کے جذبات ان کے ہر افسانے میں نظر آتی ہے۔ ان کے افسانوں میں عورت کے کردار، دیہاتیوں کی سادہ لوحی اور سادھوؤں کے مکروفریب کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

(۴) دیہاتی زندگی: پریم چند کے افسانوں میں دیہاتی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ملتی ہیں۔ جہاں ان کی مظلومیت، بدحالی اور زمیندار کے ظلم و ستم کے قصے ان افسانوں کا موضوع ہیں۔ اس کے علاوہ دیہاتی زندگی کے ماحول، پُرفریب مناظر، دیہاتیوں کی سادگی اور جہالت کو انھوں نے تفصیل سے پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ دیہاتی زبان کا استعمال بھی خوب کیا ہے۔

(۵) پریم چند بحیثیت واعظ: پریم چند کے افسانوں میں ہمیں وعظ و نصیحت کے پہلو بھی ملتے ہیں۔ ان کا افسانہ "راہِ نجات" جس میں ایک کسان اور چرواہے کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ یہ کہانی انتہائی کامیاب اور فنی لحاظ سے مکمل ہے۔

(۶) ترقی پسندی: پریم چند ترقی پسند تحریک کے ایک نمائندہ افسانہ نگار تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ ادب زندہ نہیں رہ سکتا جو انسانیت

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

سے ہم آہنگ نہ ہو۔ ترقی پسند تحریک کی کانفرنس نے انھوں نے کہا تھا کہ "ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا"۔ انھوں نے مزدور، کسان، اور سماج کے ٹھکرائے ہوئے انسانوں میں حسن تلاش کیا۔ جنھوں نے اپنے خونِ جگر سے سرمایہ داروں کی تجوریاں بھری تھیں اور ان کے بچے خود بھوک و افلاس کی زندگی گزار رہے تھے۔

(۷) کردار نگاری: پریم چند کا بڑا کارنامہ ان کی کردار نگاری ہے۔ ان کے ہاں جیتے جاگتے کردار ملتے ہیں۔ مثلاً "دھنیا" اور "مادھو" ان کے لافانی کردار ہیں۔ پریم چند اپنے کرداروں کو ایچ جی ویلز کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اپنے گرد و پیش سے تلاش کرتے ہیں۔ پریم چند اپنے کرداروں کو اپنے افسانے کے آغاز میں ہی ان کی خوبی اور خامی کو حقیقت کا رنگ دے کر قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

(۸) طنزیہ انداز: پریم چند معاشرے میں پھیلے ہوئے رسم و رواج کو تسلیم تو کرتے ہیں مگر بیہودہ رسوم پر شدید نکتہ چینی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں مختلف مقامات پر طنزیہ انداز پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے اپنے افسانوں میں معاشرتی رسم و رواج کے عیوب کا ذکر کرتے ہیں اور سماجی اور سیاسی بے قاعدگیوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔

(۹) رومانیت: پریم چند کے افسانوں میں رومانیت کی جھلک بھی ملتی ہے۔ جس نے ان کے افسانوں کو تاثر بخشا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے ہاں نیاز فتح پوری اور سجاد حیدر یلدرم جیسی رومانیت پسندی نہیں ہے مگر پھر بھی ان کے افسانوں میں ہمیں کہیں کہیں رومانیت نظر آتی ہے جو ان کے افسانوں میں جاذبیت پیدا کر دیتی ہے۔

(۱۰) طرزِ تحریر: پریم چند کی تحریر سادہ اور رواں ہے۔ اس میں شگفتگی اور بے ساختہ پن ہے۔ ان کی شخصیت کے تمام پہلو ان کے تحریروں سے جھلکتے ہیں۔ ان کی نظر وسیع ہے اور ان کا مشاہدہ عمیق ہے۔ وہ ہر موضوع کو پُر لطف انداز میں پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ تشبیہ اور استعارے کا استعمال انتہائی مناسب انداز میں کرتے ہیں، جس سے تحریر کی روانی میں فرق نہیں آتا۔

ناقدین کی آرا:

"پریم چند نے کھیتوں میں کسانوں کی کاوش کے بیج بوئے ہیں، تم اگر چاہو تو اس میں انقلاب کی فصل کاٹ سکتے ہو"۔ (کرشن چندر)

"ان کے افسانوں میں انقلاب کے قدموں کی آہٹ، آزادی کے نعروں کی گونج اور دم توڑتے ہوئے سپاہیوں کی للکار صاف سنائی دیتی ہے"۔ (ڈاکٹر سلام سندیلوی)

"سرمایہ داری وہ لعنت ہے کہ جس چیز کو چھولے اس سے کوڑھ ٹپکنے لگے اور بھوکوں کے سامنے خدا بھی روٹی کے سوا کسی اور روپ میں ظاہر نہیں ہوسکتا۔ یہی پریم چند کے افسانوں کی روح ہے"۔ (سردار جعفری)

"پریم چند کا ہر افسانہ اسٹیج معلوم ہوتا ہے اس کا ہر کردار منہ سے بول اٹھتا ہے"۔ (آغا حشر کاشمیری)

"پریم چند نے اپنی افسانہ نگاری کی بدولت داستانوں کے دروازے عام انسانوں کے لیے کھول دیئے اور ان عام انسانوں کو شہزادوں سے بڑھ چڑھ کر حسن اور پرستان کی پریوں سے زیادہ دلکشی اور دلنوازی بخشی ہے"۔ (ڈاکٹر احسن فاروقی)

آفتاب حسن

بیسویں صدی کو سائنس اور ایجادات کی صدی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس صدی میں سائنسی موضوعات کے معروف مصنف، محقق اور ماہر تعلیم میجر آفتاب حسن بازید پور (بہار) میں ۱۶ ستمبر ۱۹۰۹ء کو پیدا ہوئے۔ آفتاب حسن نے ابتدائی تعلیم بہار ہی سے حاصل کی اور وہیں سے ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء تک علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور ایم ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ اعلیٰ سائنسی تعلیم کے لیے وہ لندن چلے گئے اور وہاں سے انھوں نے کیمیا میں پی ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ لندن سے واپسی پر آفتاب حسن حیدرآباد دکن میں انسپکٹر تعلیم (سائنس) مقرر ہو گئے۔ پھر ترقی کر کے ناظم تعلیمات اور آخر میں اورنگ آباد کالج کے پرنسپل کے عہدے تک پہنچ گئے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ ملٹری اکیڈمی کاکول میں شعبہ سائنس کے سربراہ رہے۔ بعدازاں وہ اردو سائنس کالج کراچی کے پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۲ء تک وہ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی کے سربراہ رہے۔ اس دوران انھوں نے اردو میں سائنسی اصطلاحات سازی اور سائنسی موضوعات پر کتب کی اشاعت کے سلسلے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ وہ مقتدرہ قومی زبان کے پہلے معتمد تھے۔ بعدازاں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی وفات کے بعد وہ اس ادارے کے قائم مقام صدر نشین بھی رہے۔ آفتاب حسن ۲۶ فروری ۱۹۹۳ء کو کراچی میں وفات پا گئے۔ آفتاب حسن متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے سائنسی اور تحقیقی مضامین لکھے۔ وہ کئی سائنسی رسالوں کے مدیر بھی رہے۔ انھوں نے اردو زبان میں سائنسی مضامین کے تراجم بھی کیے۔ ان کی اہم تصانیف میں "اردو ذریعہ تعلیم اور اصطلاحات"، "معلومات سائنس"، "جدید معلومات سائنس"، "سائنس کی باتیں"، "سائنس سب کے لیے"، "سائنس ہمارے لیے"، "آئین اسٹائن اور کائنات" وغیرہ ہیں۔

طرزِ تحریر کی خصوصیات

۱۔ **اسلوب:** آفتاب حسن سائنس کو ایک ضروری علم سمجھتے تھے اور اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو متعارف کروانا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے مضامین کو آسان اور سادہ زبان میں پیش کیا۔

۲۔ **تفہیم و تشریح کا انداز:** کسی بھی مصنف کے لیے مضمون سے متعلق وسیع معلومات کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔ آفتاب حسن کے یہاں کسی بھی مضمون کی تفہیم و تشریح کے لیے معلومات کا بڑا ذخیرہ موجود تھا۔

۳۔ **دلکش اور دلچسپ انداز:** میجر آفتاب حسن نے اپنی تحریروں میں سائنس اور سائنسی حقائق کو دلکش اور دلچسپ انداز میں بیان کیا۔ وہ اپنے مضامین میں کہانی کا سا انداز اختیار کرتے ہیں۔

۴۔ **عام فہم مثالیں:** آفتاب حسن اپنے مضامین میں کسی بھی موضوع کی وضاحت کے لیے سادہ مثالوں سے کام لیتے ہیں۔ اُن کے یہاں بڑی ہی کارآمد اور سادہ مثالیں عام زندگی سے ہی ملتی ہیں۔ پٹرول کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: "اب رہ گیا پٹرول۔ یہی وہ صاف ستھری جلد بھڑک اٹھنے والی چیز ہے جو مشینوں کے جسم میں خون کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا کی تیز ترین مشینیں اس سے چلتی ہیں۔ ہوائی جہاز، موٹریں اور طرح طرح کی گاڑیاں اس کے بل بوتے پر طول طویل فاصلے پل بھر میں طے کر لیتی ہیں۔"

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

۵۔ **بول چال کا انداز:** آفتاب حسن کی نثر میں باتوں کی سی چاشنی اور بول چال کا سا انداز ہے۔ وہ بات کو سائنسی اسرار و رموز کو بڑے سادہ انداز میں بڑی بے تکلفی سے بیان کرتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہر امر کو پہلے خود سمجھتے ہیں اور پھر دوسروں کو اپنے انداز بیان زبان میں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

۶۔ **تاریخی و تہذیبی معلومات کی جھلک:** آفتاب حسن کے مضامین صرف سائنسی معلومات میں اضافہ نہیں کرتے بلکہ وہ تاریخی اور تہذیبی معلومات بھی فراہم کرتے ہیں۔ اور ان معلومات کو بڑی مہارت کے ساتھ آپس میں مربوط بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً وہ اپنے مضمون میں کہتے ہیں کہ "پٹرولیم کوئی نئی دریافت نہیں ہے۔ پرانے لوگ اس سے واقف تھے۔ انجیل میں اس کا ذکر موجود ہے۔ قدیم مورخ ہیروڈوٹس بابل کے قریب ایک تیل کے چشمے کا ذکر کرتا ہے۔" اس تحریر سے پتا چلتا ہے کہ آفتاب حسن نہ صرف سائنس بلکہ تاریخی و تہذیبی علوم پر بھی دسترس رکھتے تھے۔

۷۔ **روزمرہ اصطلاحات:** آفتاب حسن کی تحریر کی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بھاری بھرکم اصطلاحات اور مشکل نام استعمال نہیں کرتے بلکہ وہ سادہ تراکیب اور روزمرہ کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً پٹرولیم کے بننے کے بارے میں اصطلاحات میں الجھائے بغیر یوں بتاتے ہیں کہ: "کیمیاوی نقطۂ نگاہ سے پٹرولیم ایک بہت سادی چیز ہے۔ یہ صرف دو عناصر کاربن اور ہائیڈروجن سے مل کر بنا ہے۔ ہائیڈروجن اور کاربن کے مرکب کو کیمیا کی زبان میں ہائیڈرو کاربن کہتے ہیں۔ پٹرولیم مختلف قسم کے ہائیڈرو کاربن کا ایک آمیزہ ہے"۔

۸۔ **مدرّسانہ انداز بیان:** آفتاب حسن اپنے مضامین میں سائنس کی تفہیم کی خاطر چھوٹے چھوٹے اور مختصر جملے استعمال کرتے ہیں۔ ان کا انداز دوسروں کو سمجھانے کا سا ہے۔ وہ دوسروں کے اوپر اپنے سائنسی علم و فضل کا رعب جمائے بغیر نہایت ہمدردی کے ساتھ الفاظ اور جملوں کا انتخاب کرتے ہیں اور جہاں محسوس کرتے ہیں کہ کوئی لفظ یا جملہ مشکل ہے تو اسے مثال سے یا خط اور شکلوں سے ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً وہ خوردبینی کیڑوں کے لیے ننھے ننھے کیڑے کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

۹۔ **مختصر جملوں کا استعمال:** آفتاب حسن کے یہاں اپنے مضامین میں چھوٹے چھوٹے اور مختصر جملے استعمال کرتے ہیں، ان کا انداز کس قدر سمجھانے کا سا ہے اور وہ سانس لے لے کر بڑھتے ہیں: "پٹرولیم کو معدنی تیل بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ تیل اور ذریعوں سے بھی حاصل ہوسکتا ہے۔ پودوں میں سے بھی تیل حاصل ہوتا ہے۔ اسے نباتاتی تیل کہتے ہیں"۔ وہ اپنے ہی الفاظ کی تشریح بھی کردیتے ہیں تاکہ پڑھنے والے کو سائنس اور سائنسی علوم مشکل اور خشک محسوس نہ ہوں۔

آفتاب حسن نے سائنس جیسے موضوع پر کتابیں لکھنے پر اپنی پوری زندگی صرف کردی۔ ان کا مشن یہی تھا کہ لوگوں کو سائنس سے دلچسپی پیدا ہوا، اور وہ اسے پیچیدہ اور خشک مضمون نہ سمجھیں بلکہ ان کے اندر سائنس سے دلچسپی پیدا ہو۔ انھوں نے سائنس کی اردو زبان میں تعلیم و تدریس کے لیے جو خدمات سرانجام دیں انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۱۵ جون ۱۹۱۶ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم محلے کے قریبی مکتب میں دو سال تک حاصل

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

کی۔اس کے بعد آگرے کے اسلامیہ اسکول میں داخلہ لے لیا۔مگر یہ اسکول ان کے گھر سے بہت دور تھا اس لیے تبادلہ کروا کر وکٹوریہ ہائی اسکول میں داخل ہو گئے اور ۱۹۲۵ء تک اسکول میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ستمبر ۱۹۲۵ء میں والد کے انتقال کے بعد آگرے کو خیر باد کہہ کر بدایوں آ گئے۔بدایوں میں اکتوبر ۱۹۲۵ء میں مشن اسکول میں داخلہ لیا۔مشن اسکول سے آٹھویں پاس کرنے کے بعد ۱۹۲۹ء میں اسلامیہ ہائی اسکول بدایوں میں داخلہ لیا۔ابواللیث صدیقی نے ۱۹۳۲ء میں اسلامیہ ہائی اسکول بدایوں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اسی سال اکتوبر میں علی گڑھ کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۴ء میں انٹرمیڈیٹ کیا اور اسی سال آنرز میں داخلہ لیا۔وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو ادب میں پی ایچ ڈی کرنے والے پہلے اسکالر تھے۔انھوں نے ۱۹۴۳ء میں دبستان لکھنؤ پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ابتدا میں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔۱۹۴۸ء میں لندن اسکول آف ایشین اینڈ افریقن اسٹڈیز چلے گئے اور شمالی ہندوستان میں ہند-آریائی زبانوں پر تحقیق کی۔تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے آئے۔آپ اورینٹل کالج لاہور اور جامعہ کراچی سے وابستہ ہوئے اور شعبہ اردو کے سربراہ بھی رہے۔اسی دوران آپ نے کچھ عرصے اردو لغت بورڈ کراچی کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات بھی سرانجام دیں۔اس کے علاوہ کولمبیا یونیورسٹی کے وزٹنگ پروفیسر بھی رہے۔

تصانیف: "تاریخ زبان ادبیات اردو"،"مصحفی اور ان کا کلام"،"تجربے اور روایت"،"لکھنؤ کا دبستان شاعری"،"جرات اس کا عہد اور شاعری"،"بیسویں صدی کا اردو ادب"،"تاریخ زبان و ادب اردو"،"آج کا اردو ادب"،"کلیات مصحفی"،"نظیر اکبر آبادی اس کا عہد"،"رفت و بود"(خودنوشت)،"اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ" وغیرہ اہم تصانیف ہیں۔

طرزِ تحریر کی خصوصیات

۱۔ آسان و رواں انداز: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی تحریریں آسان اور رواں ہوتی ہیں۔ان کی تحریروں میں شادابی پائی جاتی ہے۔لکھنوی تکلف پسندی اور شاعرانہ نثر نے ان کے طرز ادا کو ذرا بھی متاثر نہیں کیا۔یہی وجہ ہے کہ وہ رجب علی بیگ سرور اور محمد حسین آزاد کی طرح مشکل اور پُر پیچ تحریریں استعمال نہیں کرتے تھے۔

۲۔ قومی زبان سے محبت: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنی پوری زندگی اردو زبان و ادب کی خدمت میں وقف کر رکھی تھی۔آپ اردو زبان کے سچے عاشق تھے۔انھوں نے استدلالی قوت سے کام لے کر اردو کا مقدمہ پیش کیا۔اردو کو اُس کا جائز مقام دلانے کی جدوجہد کی۔ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ اردو کو ہر سطح پر رائج کیا جائے۔اس کے حق میں انھوں نے جذباتی انداز میں نقطہ نظر پیش کرنے کے بجائے مخالفین کے اعتراضات کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لیا اور اُن کے خیالات کی دلائل کے ساتھ تردید کی۔

۳۔ کلاسیکی ادب: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کلاسیکی ادب کے متعلق خاص نظریہ رکھتے تھے۔کلاسیکی ادب پر لکھی گئیں ان کی کتابیں خود کلاسیکی اہمیت اختیار کر چکی ہیں۔انھوں نے جو کچھ بھی لکھا بہت سوچ بچار اور تحقیق کے بعد لکھا۔ان کی نمایاں کتب میں "لکھنؤ کا دبستان شاعری"،"مصحفی اور ان کا کلام"،"نظیر اکبر آبادی، ان کا عہد اور شاعری" کلاسیکی ادب میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔

۴۔لغت نویسی: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لغت نویسی کے بنیادی نکات کے حوالے سے سمجھتے ہیں کہ لغت نگار کا قواعد کے تمام اصولوں

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

سے واقف ہونا بہت ضروری ہے۔ لغت نویس کے لیے لازم ہے کہ وہ جدید لسانیات کے اصول سے واقفیت رکھتا ہو۔ لغت نگار کو اپنی تحقیق کو آخری اور حتمی نہیں سمجھنا چاہیے کیوں تحقیق کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔

۵۔ **تنقید نگاری:** ڈاکٹر ابواللیث صدیقی جس فن پارے پر قلم اُٹھاتے ہیں بڑی دقت نظری سے اس کے تمام پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کی تنقید کو تحقیقی تنقید بھی کہا جاسکتا ہے۔ وہ ادب پارے کی خوبیوں، خامیوں سے بحث کرتے ہوئے شاعر یا نثر نگار کی زندگی کی پوری چھان بین کرتے ہیں۔ اس کے عہد کے حالات و واقعات کا جائزہ لیتے ہیں اور اس کی روشنی میں اس فن پارے کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں۔

٦۔ **اقبال شناسی:** ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اقبال شناسوں کے اس ہراول دستے میں سے تھے جو اقبال کے نظریات کی تشریحات کر کے ملت کے نوجوانوں کو اقبال کے افکار اپنانے اور ان کے ہم قدم ہونے کی تلقین کرتے تھے۔

۷۔ **ماہر لسانیات:** بحیثیت ماہر لسانیات ڈاکٹر ابواللیث صدیقی رسم الخط کے تعلق سے اپنا ایک واضح نقطہ نظر رکھتے تھے۔ جس کے مطابق رسم الخط تبدیل کرنے سے قومیں اپنے تہذیبی ورثے سے محروم ہو جاتی ہیں۔

۸۔ **ادبی مورخ:** ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بحیثیت ادبی مورخ یہ سمجھتے ہیں کہ ادبی مورخ صرف واقعات و حقائق کی جانچ پڑتال تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ ان واقعات و حقائق اور تاریخ کا مطالعہ کر کے تاریخ کے کسی دور، کسی نظریے، رجحان یا شخصیت کے بارے میں اپنا ایک وژن رکھتا ہے جو ادبی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی تاریخ ادب کو سیاسی، تمدنی اور تہذیبی پس منظر سے ہٹ کر نہیں دیکھتے۔ اُن کا خیال ہے کہ کسی فرد یا دور کے ادبی ورثے کو اس کی تاریخ کا ایک جزو ہی سمجھنا چاہیے۔

۹۔ **صحافتی خدمات و نظریہ:** ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی شہرت ایک صحافی کی حیثیت سے تو ہرگز نہیں ہے مگر انھوں نے اس شعبے میں بھی اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ علی گڑھ میگزین کی ادارت کے دوران انھوں نے ۴ شمارے نکالے جن میں "اقبال نمبر" اور "علی گڑھ نمبر" بھی شامل ہے۔ اُن کا نظریہ ہے کہ صحافت شہرت کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک ذمہ داری کا نام ہے۔ ہر ذمہ دار صحافی اور مدیر کا ایک خاص نظریہ ہوتا ہے۔ اس کی چشم انتخاب ایسے ہی موضوعات ہوتے ہیں جو اس کی فکر سے ہم آہنگ ہوں۔

غلام ربانی آگرو

غلام ربانی آگرو علمی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کے والد درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ تھے۔ غلام ربانی آگرو ۱۹۳۳ء میں نوشہرو فیروز ضلع نواب شاہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ بعد ازاں کراچی میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ انھوں علمی وادبی ذوق ورثے میں پایا تھا۔ ابتداء میں سندھی ادبی بورڈ کے سیکریٹری مقرر ہوئے اور خاصا عرصہ وہاں کام کیا۔ بعد میں سندھ یونی ورسٹی کے پرو وائس چانسلر مقرر ہو گئے۔ انھوں نے ادارۂ ادبیات پاکستان میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھی اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا۔ جنوری ۲۰۱۰ء میں حیدر آباد میں سندھی زبان کے اس دلفریب نثر نگار نے آخری سانس لی اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔ حکومت پاکستان نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں تمغۂ امتیاز اور صدارتی ایوارڈ برائے حسنِ کارکردگی سے نوازا۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۵۵ء میں کیا تھا۔ ان کی کہانیوں شیدو دھاڑیل، کالی اور سرخ لکیریں، ھوندا حیات، وہ زندہ رہیں گے، (الاجھری مہ شال غریبن جی جھونپڑی) خدا نہ کرے کہ غریبوں کی جھونپڑی مسمار ہو، (مینھ بھار ایندو) بالآخر موسم بہار آئے گا، کو غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔

سندھی افسانہ نگاری اور ناول نگاری میں غلام ربانی آگرو کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "آبِ حیات" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے جس کا کئی غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ وہ سہ ماہی "مہران" اور ماہنامہ "گل پھل" کے ایڈیٹر بھی رہے۔

دیگر تصانیف: جھڑا گل گلاب جاب، سندھ جا بر بحر پہاڑ، ماڑھوں شہر، بھنبھور جا، بھارت میں اردو: ایک جائزہ، خط غبار (خطوط کا مجموعہ)، سندھ میں پکھین جو شکار۔

طرزِ تحریر کی خصوصیات

(۱) سندھی ثقافت: آگرو صاحب کے افسانوں میں سندھی ثقافت بہت واضح ہے۔ وہ امن و محبت کے پیغامبر رہے ہیں اور اسی کا درس دیتے ہیں۔ غریب و محکوم طبقے کے حالات سچائی اور دیانت کے ساتھ رقم کر دیتے ہیں۔ عام لوگوں کی مظلومیت غلام ربانی آگرو کی کہانیوں میں جا بجا نظر آتی ہے۔ سندھ کے وڈیرہ شاہی کلچر پر سخت تنقید کرتے ہیں۔

(۲) انسانی نفسیات: ایک اچھے افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ انسان کی مختلف کیفیات اور جذباتی رویوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انسانی نفسیات کی مختلف جہتوں کا انھوں نے گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے حقیقی زندگی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔

(۳) کردار نگاری: آگرو صاحب اپنے افسانوں میں کردار نگاری کمال کی کرتے ہیں۔ ہر کردار کے مزاج، طور طریقے، رنگ ڈھنگ کو ایسے فطری انداز میں پیش کرتے ہیں کہ تصنع کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ کردار کی گفتار، اس کا انداز، اس کا طرزِ فکر، اس کی ذہنی سطح کا لحاظ رکھتے ہیں جس سے ان کے افسانے میں مضبوط نظر آتی ہے۔

(۴) طبقاتی کشمکش: ان کے افسانوں میں معاشرے میں پائی جانے والی طبقاتی کشمکش کی ترجمان ملتی ہے۔ وہ محکوم طبقے کی ایک مؤثر آواز ہیں۔ وہ ہر اس سفاکانہ روش کے خلاف ہیں جو انسانیت کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ اقتصادی بدحالی کا شکار لوگوں کے لیے ان کی ہمدردی نمایاں ہے۔ طبقاتی کشمکش سے وہ نہ صرف بے زار ہیں، بلکہ اس کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔

(۵) دیہی زندگی کی عکاسی: غلام ربانی آگرو کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ وہ دیہات کی سادہ اور بے تکلف زندگی کو صحیح خدوخال کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ وہ دیہی زندگی کی ابتر حالت سے بھی واقف ہیں۔ ان کا قلم کچلے ہوئے طبقے اور ظلم و استبداد کا شکار لوگوں کی عمدہ عکاسی کرتا ہے۔ وہ دیہی زندگی کی معاشرت، طور طریقوں اور روایات کی عمدہ ترجمانی کرتے ہیں۔

(۶) سادگیِ بیان: غلام ربانی آگرو سادہ اور سلیس زبان لکھتے ہیں۔ ان کا طرزِ تحریر عام فہم ہے۔ عام قاری اور کم پڑھا لکھا انسان بھی ان کی تحریر سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ انھوں نے اپنے پُرتاثیر اسلوب میں کئی سماجی اور سیاسی پس منظر کے حامل افسانے تحریر کیے ہیں۔

(۷) جدید افسانہ نگار: قیامِ پاکستان کے بعد جدید سندھی افسانہ نگاری کو جن ادیبوں نے جلا بخشی ان میں جمال بزو، سراج میمن،

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

حفیظ شیخ، ع ق شیخ کے ع۔ ۂ غلام ربانی آگرو بھی شامل ہیں۔ انھوں نے افسانے کی روایت کو مستحکم کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ان کے مختصر افسانوں کو پڑھ کر بیسویں صدی کے سندھ کی وہ تصویر سامنے آجاتی ہے جس میں زرعی زمیندار خود کو بادشاہ اور (ہاری) کسان کو غلام سمجھتا تھا۔

ناقدین کی آرا: سندھ کی ادبی دنیا میں غلام ربانی آگرو ایک درخشاں ستارے کی مانند ہیں۔ (پیر حسام الدین راشدی)

شوکت تھانوی

شوکت تھانوی ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن یوپی کا قصبہ تھانہ بھون تھا۔ ان کا اصل نام محمد عمر ہے۔ شوکت تھانوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ شوکت تھانوی نے یوں ادب کی بہت سی اصناف میں تخلیقات پیش کیں، لیکن ان کی اصل شہرت مزاح نگاری ہے۔

مشہور تصانیف: سودیشی ریل، شیش محل، بیدی کی کرسی، سسرال، منشی جی، سیلابِ تبسم، دنیائے تبسم، خدانخواستہ، مابدولت، خودنوشت، (موجِ تبسم، بحرِ تبسم) ریڈیو پاکستان سے ان کا مستقل فیچر (قاضی جی) بہت مقبول ہوا۔ ان کا انتقال ۱۹۶۳ء میں ہوا۔

طرزِ تحریر کی خصوصیات

(۱) مزاح نگاری: شوکت تھانوی کا بنیادی میدان مزاح نویسی ہے۔ مضمون ہو یا افسانہ، ناول ہو یا ڈرامہ، ہر جگہ اپنے فطری رجحان کے مطابق وہ مزاح کے رنگ بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔ "سودیشی ریل" کے چھپنے کے بعد مزاح نگار کی حیثیت سے وہ جانے پہچانے لگے۔ شوکت تھانوی میں فطرتاً ظرافت تھی، اس لیے وہ مزاح بہت اچھے طریقے سے نبھا لیتے ہیں۔

(۲) بسیار نویسی: شوکت تھانوی نے بہت کم وقت میں بہت زیادہ مزاحیہ افسانے و ناول لکھے۔ اپنی بسیار نویسی کی وجہ سے وہ اپنے مزاح کے معیار کو برقرار نہیں رکھ سکے۔ انھوں نے مزاح کے تقریباً ہر حربے کو استعمال کیا۔

(۳) مزاح برائے مزاح: ان کی مزاح نگاری کے پس پردہ کوئی اصلاحی مقصد یا اخلاقی فلسفہ نظر نہیں آتا، بلکہ وہ معمولی سے موضوع پر الفاظ و محاورات اور واقعات کے ذریعے مزاح پیدا کر کے قارئین کو ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی تحریر میں کہیں کہیں قہقہے شامل ہوتے ہیں اور کہیں قاری صرف مسکرا کر رہ جاتا ہے۔

(۴) وقتی موضوعات: شوکت تھانوی نے بالعموم اپنی تحریروں میں فنی تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھا۔ جن بدلتے ہوئے حالات و واقعات پر انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں قلم اٹھایا، آج کے دور میں ان کی اتنی اہمیت نہیں رہی۔

(۵) طنز سے گریز: عام طور پر طنز و مزاح کا باہم چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ تاہم شوکت تھانوی بلاوجہ طنز سے گریز کرتے ہیں۔ ان کے ہاں مزاح زیادہ اور طنز بہت کم پایا جاتا ہے۔ طنز چوں کہ طبیعت میں ایک قسم کی گھٹن پیدا کرتا ہے، اس لیے وہ صرف مزاح کو اپنا مقصد بنا کر قاری کو خوش کرتے ہیں۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

(۶) واقعات وحالات: شوکت تھانوی نے کہیں عملی مذاق سے پیدا ہونے والی صورتوں کو موضوعِ سخن بنایا اور کہیں کردار، گفتار اور زبان کی ناہمواریوں سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ معمولی سے معمولی واقعہ کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے وہ معمولی واقعات نہ ہوں، بلکہ اہم واقعات ہوں۔ روز مرہ حالات وواقعات کو دلچسپ انداز میں پیش کرنے میں وہ کامیاب رہے۔

(۷) سادگیِ بیان: شوکت تھانوی کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ چوں کہ ان کے پیشِ نظر عام قاری ہوتا ہے، اس لیے وہ بلا ضرورت علمی رعب کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ نہ ہی واقعات کے بیان میں رنگینی کا سہارا لیتے ہیں۔ ان کی اسی سادہ بیانی اور شگفتہ اسلوب کے باعث انھیں زبردست عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔

(۸) گہرائی اور وسعت کی کمی: شوکت تھانوی کے ہاں اعلیٰ اور ادنیٰ ہر قسم کے مزاح کی مثالیں ملتی ہیں۔ البتہ گہرائی اور وسعت نہیں ملتی جو دیرپا اثر چھوڑ سکے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر "ان کے ہاں اسلوب کی شگفتگی تو ہے، مگر تازگیِ نگاہ نہیں جس کی بنا پر مزاح کا اثر نہیں ہوتا۔"

(۹) شخصیت نگاری: انھوں نے اپنے مخصوص اسلوب میں شخصیت پر مختصر مضامین یا خاکے لکھے جو کتابی صورت میں "شیش محل" اور قاعدہ و بے قاعدہ کے عنوان سے چھپ چکے ہیں۔ انھوں نے جس طرح بے تکلفانہ انداز میں شخصیت کو بیان کیا ہے، اس میں مزاح کی چاشنی بھی محسوس ہوتی ہے۔

شفیق الرحمٰن

شفیق الرحمٰن ۹ نومبر ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج راولپنڈی سے میٹرک کیا۔ ۱۹۴۲ء میں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد وہ انڈین میڈیکل سروسز سے وابستہ ہوگئے۔ طب کے ساتھ ادب سے بھی انھیں مناسبت تھی۔ شفیق الرحمٰن کو اردو ادب میں ایک افسانہ نگار اور مزاح نگار کی حیثیت سے لازوال شہرت حاصل ہوئی۔ یہ ان مزاح نگاروں میں شامل ہیں جنھوں نے آزادی سے قبل لکھنا شروع کیا اور آزادی سے قبل ہی ادبی شہرت سے ہم کنار ہوگئے۔ اُن کی ادبی صلاحیتوں کا اعتراف کم وبیش ہر نقادِ ادب نے کیا ہے۔ آپ کی تصانیف کے نام یہ ہیں: کرنیں، شگوفے، لہریں، مدوجزر، پرواز، حماقتیں، مزید حماقتیں اور پچھتاوے۔

طرزِ تحریر کی خصوصیات

۱۔ مزاح نگاری: شفیق الرحمٰن اصلاً مزاح نگار اور خالص مزاح کے نمائندے ہیں۔ ان کی کئی تحریروں کا مقصد محض ہنسنا ہنسانا ہے۔ ان کی مزاح نگاری کا انداز ہلکا پھلکا ہے جس میں شگفتگی کا عنصر نمایاں ہے۔ وہ لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، رعایتِ لفظی، فقرے بازی اور تضاد سے مزاح تخلیق کرتے ہیں۔ ان کے بعض کردار شیطان، بڈی، مقصود گھوڑا، حکومت آپا دلچسپ ہیں۔

۲۔ تحریف نگاری: شفیق الرحمٰن اپنے کرداروں کے علاوہ تحریف نگاری سے بھی مزاح پیدا کرتے ہیں۔ انھوں نے بہت سی کامیاب پیروڈیاں بھی لکھی ہیں۔ قصہ چہار درویش، قصہ پروفیسر علی بابا کا، سفرنامہ جہاز باد سندھی کا تحریف نگاری کی کامیاب مثالیں ہیں۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

۳۔ **مغربی اثرات:** بعض نقادوں کے خیال میں شفیق الرحمٰن انگریزی مزاح سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ وہ انگریزی اندازِ مزاح nonsense humour جو انگریزی ادب میں مزاح پیدا کرنے کا معروف اور مقبول طریقہ ہے کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ ان کے مزاح پاروں کی فضا پر مغربی اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔

۴۔ **شاداب نثر:** شفیق الرحمٰن نثرِ لطیف یا رومانویت کی بھی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ اپنے گہرے مشاہدے سے کام لے کر زندگی کے مختلف پہلوؤں سے مزاح اخذ کر کے شاداب اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریر میں سادگی اور روانی کے ساتھ بیان کی دلکشی متاثر کن ہے جسے پڑھ کر اکتاہٹ اور بے زاری نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابیں آج بھی سدا بہار ہیں۔

۵۔ **لطائف:** شفیق الرحمٰن کے مزاح میں لطائف و ظرائف بھی جا بجا ملتے ہیں۔ اُن پر الزام ہے کہ ان کے بعض مزاح پارے لطائف جوڑ جاڑ کر ترتیب دیے گئے ہیں۔ اس میں کسی حد تک صداقت بھی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے ایسے اچھے لطیفے جمع کر لیے ہیں کہ ہر مرتبہ پڑھ کر نیا لطف ملتا ہے۔

۶۔ **طنز کی آمیزش:** انھوں نے واقعہ اور کردار کی ہم آہنگی اور عملی مذاق سے طنز و مزاح پیدا کیا ہے۔ ان کے اندازِ بیان کی کاٹ قاری بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے۔ ان کی تحریروں میں طنز کی آمیزش کے ساتھ معاشرتی رویوں پر بڑی جاندار تنقید سامنے آتی ہے جو پڑھنے والوں کو بے ساختہ ہنسنے ہنسانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

۷۔ **بات سے بات نکالنا:** مزاح نگاری میں دل کشی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب بات سے بات نکالی جائے۔ یہ مزاح نگار کے لیے ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اکثر مزاح نگار اس میں دست رس نہیں رکھتے، کیوں کہ اس کے لیے وسعتِ علم اور قدرتِ کلام کی ضرورت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ذخیرۂ الفاظ اور مترادفات بھی لازمی ہیں۔ شفیق الرحمٰن بات سے بات نکال کر اچھا مزاح پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

۸۔ **سادگی و شگفتگی:** شفیق الرحمٰن کی تحریر سادہ، عام فہم اور شگفتہ ہے۔ ان کے بیان کی سادگی و شگفتگی دل و دماغ کو ایک نفیس روحانی کیف سے آشنا کرتی ہے۔ یہ شگفتگی بڑھ کر کبھی قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیتی ہے اور کہیں زیرِ لب مسکرانے پر۔

۹۔ **لطافتِ بیان:** شفیق الرحمٰن کے اندازِ بیان میں ایک خاص قسم کی لطافت ہے۔ وہ بالعموم فلسفیانہ، محققانہ، مسجع اور مرصع زبان سے پرہیز کرتے ہیں۔ رومانوی انداز میں انھوں نے ذہنی تفریح کا سامان فراہم کیا ہے جس میں ہنسی بھی ہے، قہقہے بھی۔ طنز کے نشتر بھی ہیں اور معاشرتی برائیوں پر دردمندانہ اظہار بھی۔

حرفِ آخر: آج اردو ادب کے دامن میں طنز و مزاح جس دلکشی، رعنائی اور امتیازی شان سے جلوہ گر ہے، اس میں شفیق الرحمٰن کی کاوشوں کا بڑا حصہ ہے۔

ابنِ انشا

ابنِ انشا جون ۱۹۲۷ء میں مشرقی پنجاب کے ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لدھیانہ میں حاصل کی۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے تھے۔ انھوں نے پنجاب یونی ورسٹی سے بی اے اور اردو کالج سے ایم اے کیا۔ وہ ایک اچھے شاعر، منفرد مزاح نگار اور عمدہ

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

سفرنامہ نگار کی حیثیت سے سے معروف ہیں۔ ان کی مشہور تصانیف میں چاند نگر، اس بستی کے اک کوچے میں، دنیا گول ہے، آوارہ گرد کی ڈائری، اردو کی آخری کتاب، ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں شامل ہیں۔

طرزِ تحریر کی خصوصیات

۱۔ طنز و مزاح: ابنِ انشا نے نثر کے میدان میں طنز و مزاح نگاری کا انداز اختیار کیا۔ طنز میں مزاح کی آمیزش نے ان کی تحریروں کو زیادہ پُر اثر بنا دیا۔ عوام سے قریب ہونے کے لیے انھوں نے اخبارات میں کالم نویسی کا آغاز کیا۔ سفرنامے لکھے، اس طرح اپنے مشاہدات اور تجربات کو طنز و مزاح کے پیرائے میں بیان کر کے شہرت حاصل کی۔

۲۔ زبان و بیان: ابن انشا کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ وہ نہایت سادہ انداز میں اپنی بات کہہ دیتے ہیں کیوں کہ ان کے پیشِ نظر عام قاری ہوتا ہے۔ وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ بات سادہ اور پُر اثر انداز میں کہی جائے۔

۳۔ صاحبِ طرز مزاح نویس: ان کی منفرد تحریر خود اظہار کرتی ہے کہ اس کے خالق ابنِ انشا ہیں۔ اپنے مخصوص اسلوبِ نگارش کی وجہ سے انھوں نے مزاح نگاری میں ایک باوقار مقام حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج بھی عوام اور خواص میں مقبول ہیں۔

۴۔ طنز کے نشتر: ابنِ انشا بنیادی طور پر ایک مزاح نگار ہیں لیکن وہ ہنسی ہنسی میں طنز کے ہلکے سے نشتر لگا دیتے ہیں۔ وہ فقروں اور جملوں کو کچھ اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ ان میں چھپے ہوئے طنز کو معلوم کر کے قاری اپنے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں لطافت اور شگفتگی محسوس کرتا ہے۔ بطورِ مثال یہ اقتباس دیکھیے:

''جاپان میں اسلام ترقی کر رہا ہے جس کا ای ثبوت یہ ہے کہ اب کے وہاں دو بقر عیدیں ہوئیں۔ ایسا اختلاف وہیں ہوتا ہے جہاں مسلمان زیادہ ہو جائیں۔''

۵۔ سفرناموں میں مزاح کی جھلک: ابنِ انشا کے سفرناموں میں کئی مقامات پر شگفتگی بیان اور صورتِ حال کے مزاح کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ ابن انشا نے مزاحیہ عناصر اتنی باقاعدگی، مہارت اور اعتماد سے داخل کر دیے کہ وہ ابنِ انشا کی پہچان بن گئے، بلکہ اردو سفرناموں میں ''مزاحیہ سفرناموں'' کی باقاعدہ داغ بیل ڈال گئے۔

۶۔ شگفتہ کالم نویسی: ابنِ انشا نے کئی برس مختلف اخبارات و رسائل میں کالم نگاری کی۔ ان کالموں میں ابن انشا کا فطری مزاح اپنی بہار دکھا رہا ہے۔ اپنی شاندار حسِ مزاح اور شگفتہ مزاجی کے سبب وہ حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے گل بوٹے ٹانکتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی کالم نگاری کا اسلوب گوناگوں خوبیوں کے باعث ناقابلِ تقلید ہے۔

۷۔ عصری صورتِ حال پر تبصرہ: ملکی سیاست پر ابنِ انشا نے اپنی شاہکار کتاب ''اردو کی آخری کتاب'' میں تفصیل سے اظہار کیا ہے۔ اس میں نہ صرف ان کا مخصوص اسلوب عروج پر ہے اور انھوں نے شگفتہ طنز کی عمدہ مثالیں ہیں، بلکہ سیاسی حالات کا بھی نقشہ عمدگی سے کھینچا ہے۔

۸۔ **موازنہ سے مزاح:** وہ اکثر اپنے سفرناموں میں مغرب ومشرق کا موازنہ کرتے ہیں۔ مغرب کی بے راہ روی کے ذکر کے ساتھ مشرق اور مسلم معاشروں کی کی برائیوں پر موازنے کے ذریعے طنز کرتے ہیں۔ مغرب کی خوبیوں کا ذکر کر کے ایک طرح سے وہ مشرق اور مسلمانوں پر اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ کرتے ہیں جس میں دھیما دھیما طنز چھپا ہوتا ہے۔

حرفِ آخر: ابنِ انشا کے مزاح نے اردو ادب پر گہرے اور ناقابلِ فراموش نقوش چھوڑے ہیں۔ وہ ایک فطری مزاح نگار تھے۔ ان کا دھیما اور رواں اسلوب اور شگفتگی، مقصدیت اور احساسِ درد یہ سب چیزیں مل کر انھیں ایک منفرد اور ممتاز مزاح نگار بناتی ہیں۔

www.downloadclassnotes.com

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

شعراء پر تبصرہ

میر تقی میر

میر تقی میر کو ایک عظیم شاعر ہی نہیں بل کہ خدائے سخن کہا گیا ہے، اردو میں بہت کم شاعر ایسے ہیں جن کی زندگی اور شاعری میں ہم آہنگی پائی جائے، یہ خوبی میر کے ہاں ملتی ہے۔ ان کی زندگی درجہ سے معمور تھی، اپنوں کی بے رخی، تنگ دستی، دل کی بربادی، محبت میں ناکامی اور پھر ان کی حد سے بڑھی ہوئی نازک مزاجی اور خودداری نے ان کی زندگی کو رنج و الم کا مجموعہ بنا دیا۔ اور اس رنج و غم کو انھوں نے شعر کے سانچے میں ڈال کر ہر دل کی دھڑکن بنا دیا۔ میر کی شاعری کی چیدہ چیدہ خصوصیات درج ذیل ہیں۔

۱۔ **غم پرستی:** میر کی شاعری درد و غم کی ترجمان ہے۔ انھوں نے غم، عشق اور غم روزگار کے ردعمل کے طور پر پیدا ہونے والے غم کو اپنی شاعری میں پوری طرح سمویا ہے۔ ان کا غم چوں کہ زندگی کی حکایت ہے اس لیے یہ ہر دل کو تڑپا کر رکھ دیتا ہے۔ بقول بابائے اردو ان کا ہر شعر ایک آنسو ہے اور ہر مصرع خون کی ایک بوند۔

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا — لو ہو آتا ہے جب نہیں آتا
ہر گل زمیں یہاں کی رونے ہی کی جگہ تھی — مانند ابر ہر جا میں زار زار رویا

۲۔ **سوز و گداز:** میر کی ذاتی ناکامیوں اور محرومیوں نے ان میں سوز و گداز اور احساس کی شدت پیدا کر دی تھی۔ ان کا لہجہ دھیما اور آواز پُرسوز ہے۔ لیکن اس میں اتنی تڑپ ہے جو سننے والے کے دل میں ہلچل مچا دیتی ہے۔

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
میں طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہوں لیکن — سینے میں جیسے دل کو کوئی ملا کرے ہے

۳۔ **تغزل:** تغزل کے میدان میں آج تک میر کی برابری کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکا، اور بقول مولوی عبدالحق "انھوں نے جس درد اور سوز کے ساتھ یہ نغمہ چھیڑا ہے اس کی مثال دنیائے اردو میں نہیں ملتی" یہ حقیقت ہے کہ ان کا کلام تغزل کی تمام رعنائیوں سے بھرپور ہے۔

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے — اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آوے
سر مارنا پتھر سے اور ٹکڑے جگر کرنا — اس عشق کی وادی میں ہر نوع بسر کرنا

۴۔ **دردمندی:** میر کی شاعری میں دردمندی کا جذبہ ہر شعر اور ہر غزل پر چھایا ہوا ہے۔ ان کی دردمندی ان کی ناکامیوں ان کے خاندانی حالات اور زمانے کی مصیبتوں کی پیداوار ہیں جسے زندگی کی تلخیوں اور آرزؤں کی شکست نے شدید کر دیا ہے۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو — ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے
دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے — پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

۵۔ آدابِ عشق: میر کے نزدیک محبوب کا درجہ بہت بلند ہے۔ وہ اس بات کو آدابِ عشق کے خلاف سمجھتے ہیں کہ عاشق سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جو محبوب کی رسوائی کا سبب بنے چناں چہ کہتے ہیں۔

میر جی رازِ عشق ہوگا فاش — چشم ہر لحظہ مت پُر آب کرو
رات محفل میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے — جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

۶۔ سہلِ ممتنع: یعنی ایسا شعر کہا جائے جو نثر معلوم ہو اور ہر کوئی یہ سمجھے کہ ایسا شعر تو وہ بھی کہہ سکتا ہے لیکن کہنے بیٹھے تو کہہ نہ پائے۔ میر کے بے شمار اشعار اس تعریف پر پورا اترتے ہیں۔ وہ نہایت سادگی سے اپنی بات کہتے ہیں۔

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے — یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے
یوں اٹھے آہ اُس گلی سے ہم — جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

۷۔ بول چال کا اور خطابیہ انداز: میر کی شاعری میں بول چال کا انداز ایک خاص لطف پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنے اشعار میں کسی نہ کسی سے مخاطب ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ میر اسی سے ہم کلام ہیں۔

اب دیکھ لے کہ سینہ بھی تازہ ہُوا ہے چاک — پھر ہم سے اپنا حال دکھایا نہ جائے گا
سیر کی ہم نے ہر کہیں پیارے — پھر جو دیکھا تو کچھ نہیں پیارے

۸۔ موسیقیت: میر کو موسیقی کا گہرا شعور ہے۔ ان کی بحریں بڑی مترنم اور شیریں ہوتی ہیں۔ انھوں نے لطیف جذبات کی ترجمانی کے لیے فارسی بحروں کے ساتھ ہندی بحروں سے بھی کام لیا ہے۔ وہ الفاظ اور ترکیب کے صوتی تاثر سے اچھی طرح واقف ہیں۔

عشق و محبت کیا جانوں میں لیکن اتنا جانوں ہوں — اندر ہی اندر سینے میں میرے دل کوئی کھاتا ہے
پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے — جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

۹۔ تکرارِ الفاظ: تکرارِ الفاظ سے ایک خاص تاثر پیدا کرنا میر کی ایک خاص خوبی ہے۔ وہ اشعار کے مفہوم میں وسعت اور منظر کشی کے لیے تکرارِ الفاظ سے بڑی خوبصورتی سے کام لیتے ہیں اور ایسے ایسے شعری کمال دکھاتے ہیں کہ آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔

رنگ شکستہ، دل ہے شکستہ سر ہے شکستہ مستی میں — حال کسو کا اپنا سا اس مے خانے میں خراب نہیں
تُو پاس نہیں ہُوا تو روتے روتے — رہ رہ گئی ہے پہر پہر رات

۱۰۔ طنزیہ انداز: میر بہت لطیف طنز کرتے ہیں۔ اس میں غالب جیسی کاٹ اور گرمی تو نہیں ہوتی لیکن نشتر کی سی چبھن ہوتی ہے۔ وہ اس معاملے میں خود کو بھی نہیں بخشتے۔

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میر — کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو
زور وزر کچھ نہ تھا تو بارے میر — کس بھروسے پہ آشنائی کی

۱۱۔ تصوّف: میر تصوّف کے نہیں تغزل کے شاعر ہیں۔ لیکن اس دور کے رواج کے مطابق ان کی شاعری میں عارفانہ مضامین بھی ملتے ہیں۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

ہر قدم پر تھی اس کی منزل لیک　　　سر سے سودائے جستجو نہ گیا
جلوہ ہے اسی کا سب گلشن میں زمانے کے　　　گل پھول کو ہے اُن نے پردہ سا بنا رکھا

۱۲۔ خوبصورت تشبیہات: میر کو تشبیہات کے استعمال میں پوری قدرت حاصل ہے۔ فارسی تشبیہات کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے ماحول سے بھی تشبیہات اخذ کی ہیں۔

ان گل رخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں　　　جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں
دِلا بازی نہ کر ان گیسوؤں سے　　　نہیں آساں کھِلانے سانپ کالے

۱۳۔ دنیا کی بے ثباتی کا احساس: مسلسل ناکامیوں اور دکھوں نے میر کے دل میں دنیا کی بے ثباتی کا احساس اور گہرا کر دیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ خوشی کے لحات بہت مختصر ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں زندگی کی ناپائیداری کا احساس بہت واضح ہے۔

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات　　　کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا
دیکھیے رفتہ رفتہ کیا ہووے　　　ہم بھی چلنے کو ہیں کہ آئی ہے

ناقدین کی آراء:

"فارسی کی طرح اردو شاعری بھی اپنا خدا رکھتی ہے ا[illegible] وہ میر کہلاتا ہے۔" (مجنوں گورکھ پوری)

"میر اردو کے شیخ سعدی ہیں ان کا کلام اکثیر شاعری ہے۔" ([illegible])

"میر تقی میر شہنشاہ سخن نہیں خدائے سخن ہیں۔" (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

"میر تقی میر سرتاج شعرائے اردو ہیں ان کا کلام اسی ذوق وشوق سے پڑھا جائے گا جیسے سعدی کا کلام فارسی میں۔" (مولوی عبدالحق)

"اردو کے بہت کم شعراء کے ہاں حقائق کی جستجو کے لیے اتنی تڑپ پائی جاتی ہے جتنی میر کے کلام میں۔" (ڈاکٹر سید عبداللہ)

خواجہ میر دردؔ

جس طرح میر تقی میر کو امام سخن کہا جاتا ہے اسی طرح اگر درد کو تصوف کی شاعری کا امام کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ درد پہلے شاعر ہیں جنھوں نے صوفیانہ معاملات کو باقاعدہ طور سے اپنی شاعری میں شامل کیا چوں کہ درد خود بھی صوفی تھے اس لیے ان کے کلام میں قال کی نہیں بل کہ حال کی کیفیت نمایاں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تصوف ان کی ذات میں رچ بس گیا تھا۔ درد کی شعری خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱۔ صوفیانہ انداز: درد عملاً ایک درویش تھے۔ اس لیے تصوف اور اس کے مسائل پر ان کی گہری نظر تھی۔ لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بڑی خوبی سے تصوف کو غزل کے سانچے میں ڈھالا ہے اور خشک صوفیانہ خیالات کو نہایت لطافت اور شگفتگی کے ساتھ زبان شعر میں ادا کیا ہے۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پاسکے　　میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے
ہستی ہے جب تک ہم ہیں اسی اضطراب میں　　جوں موج آپھنسے ہیں عجب پیچ و تاب میں

۲۔ سادگی اور روانی: میر درد کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت سادگی اور روانی ہے۔ ان کے ہاں نا قابل فہم تشبیہات، پیچیدہ استعارات اور مشکل الفاظ کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے۔ تصوف کے خشک مسائل کو بھی انتہائی سادگی سے بیان کرنے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے　　مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا
ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے　　تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے؟

۳۔ وحدت الوجود: درد کا محبوب اللہ تعالیٰ ہے۔ انھیں ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کا جلوہ نظر آتا ہے۔ جب، ہر چیز اور ہر شخص میں ایک ہی ہستی جلوہ گر ہے تو یہ فرق اور امتیاز بے معنی ہے، درد کے کلام میں جگہ جگہ اس نظریے کی عکاسی ملتی ہے۔

ہے جلوہ گاہ تیرا کیا غیب کیا شہادت　　یاں بھی شہود تیرا واں بھی شہود تیرا
مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں　　ہم آئینے کے سامنے جب آکے ہُو کریں

۴۔ تغزل: درد کی غزل میں دہلوی شاعری کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ وہی زبان کی صفائی، درد کی چاشنی، وہی لہجے کی بے ساختگی، وہی سوز و گداز۔ غرض درد کی شاعری محض تصوف کی بناء پر ہی نہیں بل کہ خالص تغزل کی حیثیت سے بھی اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔

دل کس کی چشم مست کا سرشار ہوگیا　　کس کی نظر لگی جو یہ بیمار ہوگیا
درد کے آنے کا اے یار برا کیوں مانا　　اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

۵۔ ناصحانہ انداز: درد ایک باعمل صوفی تھے۔ ان کا بنیادی کام اپنے مریدوں کی اصلاح تھا۔ اس لیے ان کی شاعری میں ناصحانہ انداز نمایاں ہے۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو　　ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّ و بیاں
جنھوں کے دل میں جگہ کی ہے نقش عبرت نے　　سدا نظر میں وہ لوح مزار رکھتے ہیں

۶۔ عشق مجازی: درد کی غزل میں صرف صوفیانہ خیالات ہی نہیں بل کہ عشق مجازی کی بھی تمام کیفیات ملتی ہیں۔ ان کے عاشقانہ اشعار میں محبت، قلبی واردات، شکوہ، تاثیر، رچاؤ اور احساس موجود ہے۔

یک بیک نام لے اٹھا میرا　　جی میں کیا اس کے آگیا ہوگا
دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے　　آن میں کچھ ہے آن کچھ ہے

۷۔ عظمت انسانی کا احساس: درد کو انسانی عظمت کا پورا احساس ہے۔ وہ انسان کو اللہ تعالیٰ کا ایک حسین شاہکار سمجھتے ہیں۔ چنانچہ انسانی عظمت کی عکاسی ان کے کلام میں جگہ جگہ ملتی ہے۔

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

۸۔ کائنات کا مشاہدہ: درد کے اشعار میں حسرت کا اظہار اور پھر حقیقت کی تلاش اور اس کے لیے کش مکش پائی جاتی ہے۔ لیکن ان کے کلام میں مشاہدۂ کائنات نے جان ڈال دی ہے۔ ان کے اشعار حقیقت کے قابل نہیں۔ وہ زندگی کو مختصر سمجھتے ہوئے دنیا کے مشاہدے کو غنیمت سمجھتے ہیں۔

فرصت زندگی بہت کم ہے مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے
انساں کی ذات سے ہیں خدائی کے کھیل یاں بازی کہاں بساط پہ گر شاہ ہی نہیں

۹۔ سوز و گداز: میر درد کی شاعری اگرچہ اعتدال کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ لیکن سوز و گداز اور تاثیر کا ایک خوبصورت مرقع ہے۔ لیکن میر کی طرح وہ آنسوؤں کے دریا نہیں بہاتے بل کہ صرف آہ بھر کر رہ جاتے ہیں۔ ان کی بات دل سے نکلتی ہے۔ اور دل میں اتر جاتی ہے۔

خار مژہ پڑے ہیں مری خاک میں ملے اے دشت اپنے کیجیو داماں کی احتیاط
دل زمانے کے ہاتھ سے سالم کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا

۱۰۔ موسیقیت: درد کوئی روکھے پھیکے خشک مزاج صوفی نہ تھے بل کہ فنون لطیفہ سے پوری طرح آشنا تھے۔ خاص طور پر موسیقی سے انھیں گہرا لگاؤ تھا اس لیے ان کی شاعری میں ترنم نمایاں ہے۔ خاص طور پر چھوٹی بحر کی غزلوں میں بے پناہ موسیقیت پائی جاتی ہے۔

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا
میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا

۱۱۔ نشاطیہ لہجہ: درد کے کلام کا لب و لہجہ نشاطیہ ہے۔ ان کے ہاں زندہ دلی کے مضامین پائے جاتے ہیں اور وہ صوفی ہونے کے باوجود پڑھنے والے کو دل شکستہ نہیں ہونے دیتے۔

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں زندگانی کچھ رہی تو نوجوانی پھر کہاں
درد اس کی بھی دید کر لیجیے نوجوانی یہ مفت جاتی ہے

۱۲۔ مجاز اور حقیقت کی ہم آہنگی: درد کے کلام کا بہترین حصہ وہ ہے جس میں مجاز و حقیقت کچھ اس طرح ہم آہنگ اور شیر و شکر نظر آتے ہیں کہ قاری یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ درد کا مخاطب محبوب حقیقی ہے یا محبوب مجازی۔

جان پہ کھیلا ہوں میں میرا جگر دیکھنا جی رہے یا نہ رہے مجھ کو ادھر دیکھنا
قاصد نہیں یہ کام ترا، اپنی راہ لے اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

ناقدین کی آراء:

رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں: "درد اردو شاعری کے تاج کا سب سے بڑا ہیرا ہے"

آب حیات میں محمد حسین آزاد لکھتے ہیں: "درد چھوٹی بحروں میں جو غزلیں کہتے ہیں گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے ہیں"

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

عظمت اللہ خان کہتے ہیں: "خواجہ میر درد صوفیانہ شاعری کے باوا آدم ہیں"۔

امیر مینائی درد کی غزلوں کے بارے میں کہتے ہیں: "یہ پسی ہوئی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں"

مرزا علی خان لطف فرماتے ہیں: "اگرچہ دیوان ان کا مختصر ہے مگر سراپا درد و اثر ہے"۔

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ درد کا انداز بیاں بے ساختہ اور رواں ہے۔ ان کی شاعری کے خصوصی موضوعات، خدا تعالیٰ کی معرفت، مشاہدۂ کائنات اور انسانی زندگی کا مقصد خدا کے قرب کا حصول، اور نیکی کا صحیح تصور ہیں، ان کا کوئی شعر بھی حکمت سے خالی نہیں، وہ صحیح معنوں میں صوفیانہ شاعری کے امام ہیں۔

نظیر اکبر آبادی

شیخ ولی محمد نظیر اکبر آبادی 1735ء میں پیدا تو دہلی میں ہوئے، والدین کے ہمراہ اکبر آباد (آگرہ) میں آکر آباد ہو گئے۔ نظیر اکبر آبادی کو اردو کا پہلا عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی اردو شاعری کو خواص کی دائرہ قید سے نکال کر عوام الناس کی زبانوں اور سماعتوں کی نذر کرنے والی وہ عظیم شخصیت ہیں جو اپنے زمانے میں ناقدین اور فضلا کے "روایتی معیار شاعری" پر پورا نہ اترنے کے سبب ادبی فراموشی کی گہری دھند میں عرصہ دراز تک نظروں سے اوجھل رہی۔ آج جب وقت نے حقیقت پسندی کی روشنی سے ذہنی فکر و افکار کو ایک نئی جلا بخشی ہے، نظیر اکبر آبادی "عوامی اور جمہوری شاعر" کے تاج کو سجائے اردو شاعری کی مسند پر بڑی شان سے رونق افروز ہیں۔ نظیر اکبر آبادی جدید اردو نظم کی پیش رو اور نظم کے خمیر میں گندھی غزل کے اوّلین معماروں میں بھی شمار ہوتی ہے۔

بچپن ہی سے تمام کھیل تماشوں، میلے ٹھیلوں، مختلف مذہبی تہواروں اور کھیلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ تجربات اور مشاہدات کی ایک دنیا شخصیت میں رچ بس گئی تھی۔ طبیعتاً بڑے سادہ اور قناعت پسند انسان تھے۔ معلمی ہی تاعمر ذریعہ معاش رہی۔ معاشی فارغ البالی تو کبھی نصیب نہ ہو سکی لیکن قناعت پسندی کے جوہر نایاب نے کبھی حیات میں تلخی نہ گھولنے دی اور انکساری بھی ذات میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ خود اپنی کہانی، اپنی زبانی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کہتے ہیں جس کو نظیرؔ سنیے ٹک اس کا بیاں ۔۔۔ تھا وہ معلم غریب بزدل و ترسندہ جاں
لکھنے کی یہ طرز تھی کچھ جو لکھے تھا کبھی ۔۔۔ پختگی و خامی کے اس کا تھا خط درمیاں
شعر و غزل کے سوا شوق نہ تھا کچھ اسے ۔۔۔ اپنے اس شغل میں رہتا تھا خوش ہر زماں
فضل نے اللہ کے اس کو دیا عمر بھر ۔۔۔ عزت و حرمت کے ساتھ پارچہ و آب و ناں

نظیرؔ نے طویل عمر پائی اور ۹۵ برس کی عمر میں دار فانی سے کوچ کیا۔

نظیر اکبر آبادی کی شاعری کی چیدہ چیدہ خصوصیات درج ذیل ہیں:

(ا) **عوامی شاعر:** نظیر اردو شاعری کی تاریخ میں ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ اردو کے پہلے عوامی بلکہ باغی اور ترقی پسند شاعر

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

ہیں۔ان کے ہاتھوں اردو میں نظم کی بنیاد پڑی۔ جب غزل، قصیدہ اور مثنوی کی حکمرانی تھی،اس وقت نظیر کی شاعری نے ایک ردعمل کے طور پر رسمی درباری شاعری کے خلاف آواز بلند کی۔عوام کے دکھ درد، ان کی محبتیں، نفرتیں، ان کے مشاغل اور تفریحات کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔انھوں نے واقعات، تجربات اور مناظر کو اصل رنگ میں پیش کیا ہے۔عوام کے میلوں، تہواروں اور تقریبات کو خوبی سے بیان کیا ہے۔وہ موسموں سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ برسات کے حسین موسم کو انھوں نے کس طرح بیان کیا ہے۔ملاحظہ ہو:

جو اس ہوا میں یارو دولت میں کچھ بڑھے ہیں   ہے ان کے سر پہ چھتری ہاتھی اپر چڑھے ہیں
ہم سے غریب غربا کیچڑ میں گر پڑے ہیں   ہاتھوں میں جوتیاں ہیں اور پائچے چڑھے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

(۲) سادگی و پُرکاری: نظیر اکبرآبادی کی زبان سادہ، بے تکلف صاف اور اصلیت کے قریب ہے۔وہ تصنع اور تکلف سے کام نہیں لیتے ہیں۔ان کی نظمیں حقیقت کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔وہ فارسی کے دقیق الفاظ، ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں سے کام نہیں لیتے بلکہ مناظر فطرت جن میں موسموں، باغوں، تہواروں، تقریبوں، مختلف رسومات کے مناظر کی ہو بہو عکاسی کرتے ہیں اور عام دلچسپی کے نقطۂ نظر سے ان کی منظر کشی ایک مخصوص انفرادیت رکھتی ہے۔

کوچے میں کہیں اور کہیں بازار میں گرا   کوئی گلی میں گر کے ہے کیچڑ میں لوٹتا
رستے کے بیچ پاؤں کسی کا رپٹ گیا   اس سب جگہ کے گرنے سے آیا جو بچ بچا
وہ اپنے گھر کے صحن میں آکر پھسل پڑا

(۳) انسان دوستی اور فلسفہ حیات: نظیر ایک انسان دوست، وسیع المشرب، صلح کُل اور پُرخلوص انسان تھے جن کے دل کے دروازے تمام مذاہب، مسالک اور نسلوں کے لوگوں کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔نظیر نے کبھی کسی کی ہجو لکھی اور نہ ہی کسی نواب کا قصیدہ لکھا۔اُن کی شاعری میں محبت کا پرچار اور فقیری کا رنگ غالب ہے۔وہ انسان کو زندگی کی دلچسپیوں اور خوش کن واقعات کی سیر ضرور کراتے ہیں لیکن ساتھ ہی انسانی زندگی کی بے ثباتی اور تلخ معاشرتی حقائق سے بھی روشناس کراتے ہیں۔ان گنت فقیر اور بنجارے، چھنے اور کڑوں کی دھن پر جب نظیر کا کلام پڑھتے ہیں تو رنج والم کا ایک احساس لمحے بھر کو آنکھوں میں نمی اور دل میں ایک کسک ضرور پیدا کر دیتا ہے۔خواب غفلت، کوڑی کی فلاسفی، پیسے کی فلاسفی، زر کی فلاسفی، آٹے دال کی فلاسفی، روٹی کی فلاسفی، پیٹ کی فلاسفی، آدمی کی فلاسفی (آدمی نامہ)، موت کی فلاسفی، دنیا اور سفر آخرت پڑھ لیجیے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی آئینے کے سامنے آن کھڑی ہے۔اپنے ناصحانہ کلام میں نظیر نے کئی جگہ تمثیلی انداز بھی اپنایا ہے مثلاً بنجارہ نامہ، ہنس نامہ وغیرہ:

یہ بدھیا لادے بیل بھرے جو پورب پچھم جاوے گا   یا سود بڑھا کر لاوے گا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا   دھن دولت ناتی پوتا کیا اک کنبا کام نہ آوے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

(بنجارہ نامہ)

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

(۴) ہندوی رنگ وروپ: نظیر نے اپنی شاعری میں فارسی شاعری کی اصنافِ سخن اور بحور و اوزان کی حد تک ہی پیروی کی اور اردو شاعری کا تعلق مقامی زمین اور عوام سے جوڑنے کے لیے ہندوستانی موضوعات، تلمیحات و کنایات کی خوبصورتی کا پیراہن اپنی شاعری کے بدن پر سجا دیا۔ یہ اردو زبان و ادب کی ترقی و وسعت کی طرف ایک انقلابی قدم تھا۔ مقامی الفاظ کے برمحل اور موزوں استعمال سے اردو شاعری کے سراپے میں اپنی ہی مٹی کی خوشبو، اپنی ہی معاشرت کا فطری رنگ اور اپنے ہی ماحول کی حقیقی جھلک رچ بس گئی۔ نظیر کے ہاں ہندوستان ہی کی تاریخی عمارات، بادشاہان، موسموں، پرندوں اور مظاہرِ قدرت کا ذکر بڑے ذوق و شوق اور چاؤ سے موجود ہے۔ بیرونی روایات، مظاہر اور شخصیات جو کہ فارسی شاعری کے تتبع میں ہمارے شعرا کی گھٹی میں شامل ہو گئی تھیں، نظیر نے اِن سے اپنا دامن بچا لیا۔ نظیر کی شاعری میں بلبل کے بجائے کوئل کی میٹھی کوک، طوطی اور کبک کے دل موہ لینے والے گیت سنائی دیتے ہیں۔ کوئل، طوطی اور کبک سب کے سب ہندوستان کے مقامی پرندے ہیں اور بلبل تو یہاں پائی ہی نہیں جاتی۔ ذرا ان اشعار کی لفظیات کو دیکھیے سرتاپا مقامی ہیں:

اس سیہ ابر میں یوں اُڑتے ہیں بگلے جیسے — لب مالیدہ مسی میں دُرِ دنداں کی ضیا
جگنو اِس طرح چمکتے ہیں کہ جوں وقت سنگار — ماتھے پر ہاتھی کے شنگرف ہے گویا چھڑکا
مور کا شور، فغاں غوک کی، جھینگر کی جھنکار — پی پی ھر آن پپیہے کی ہے کوئل کی صدا

(۵) موضوعات کا تنوع: روزمرہ زندگی کے وہ موضوعات جو ہر انسان کی زندگی کے تانے بانے سے جڑے ہوئے ہیں لیکن نظیر کے دور کی شاعری کے لیے شجرِ ممنوعہ سمجھے جاتے تھے، نظیر نے انھیں آگے بڑھ کر گلے ہی نہیں لگایا، اپنے مشاہدات، تجربات، باریک بین نگاہوں اور اپنے کمالِ فن سے اُنھیں ایک نئی زندگی بخش دی ہے۔ ان کے موضوعات میں جہاں حمد و نعت اور منقبت شامل ہیں، وہاں دوالی، راکھی، جوگن، جنم کنھیا، بلدیو جی کا میلہ بھی شامل ہیں۔ نظیر کا شاعرانہ وجدان مناظرِ فطرت کو بھی اپنی تمام تر خوبصورتی اور سادگی کے ساتھ اپنی شاعری کے کینوس میں پینٹ کر دیتا ہے۔ برسات کی بہاریں، برسات کا تماشا، جاڑے کی بہاریں، برسات اور پھسلن جیسی نظمیں بھی اُن کے قلم سے لفظوں کے بجائے رنگوں سے منظر کشی کرتی نظر آتی ہیں۔ یہی نہیں تل کے لڈو، نارنگی، پنکھا، آگرہ کی ککڑی، تربوز، مکھیاں، ریچھ کا بچہ، کورا برتن، کوا اور ہرن کا بچہ، آندھی بھی اس زندہ دل، سادہ لوح اور حیاتِ انسانی کے ہر گوشے سے پیار کرنے والے شاعر نظیر کے قلم سے اپنا رشتہ جوڑ لیتی ہیں۔ نظیر میں یہ کمال بدرجۂ اتم موجود ہے کہ وہ بظاہر بہت معمولی نظر آنے والی باتوں اور واقعات سے ایسے ایسے مطالب اور مفاہیم پیدا کر لیتے ہیں جو کہ کئی شعرا بڑے دقیق موضوعات سے کشید کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں:

دنیا میں اب انھوں کے تئیں کہیے بادشاہ — جن کے بدن درست ہیں دن رات سال و ماہ
جس پاس تندرستی و حرمت کی ہو سپاہ — ایسی پھر اور کون سی دولت ہے، واہ واہ
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست — اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

(تندرستی نامہ)

(۶) دنیا کی بے ثباتی: نظیر اکبرآبادی کے یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی ولی کامل دنیا کے بے ثباتی اور بے وقعتی کا ذکر کر رہا ہے اور اپنی شاعری کے ذریعے زندگی کے رموز سکھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جو مصائب و آلام سے مبرا ہیں۔ ان کی نظموں میں "بنجارہ

نامہ"، "موت پر"، اور "کلجگ" بہت اہم ہیں۔

نیکی کا بدلہ نیک ہے بد کر بدی کو سات لے ۔۔۔ کانٹے لگا کانٹے پھلیں، پھل پات بو پھل پات لے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یا دن کو دے اور رات کو لے ۔۔۔ کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

(۷) شہر آشوب: جب کوئی معاشرہ زوال پذیر ہوتا ہے تو وہاں معاشی بدحالی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ نظیر اکبرآبادی کی نظم "آگرہ کی تباہی" اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ جس میں انھوں نے ہر پیشہ سے وابستہ افراد کی تباہی اور بدحالی کا ذکر کیا ہے۔ اس نظم میں نظیر آگرہ شہر کی تباہی کا منظر پیش کر رہے ہیں۔

صراف، بنیے، جوہری اور سیٹھ ساہوکار ۔۔۔ دیتے تھے سب کو نقد سو کھاتے ہیں اب ادھار
بازار میں اڑے ہے پڑی خاک بے شمار ۔۔۔ بیٹھے ہیں یوں دوکانوں پہ اپنی دوکان دار
جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند

(۸) ظریفانہ رنگ: نظیر اکبرآبادی کے کلام میں خوش طبعی اور ظریفانہ رنگ موجود ہے۔ وہ افلاس، مصیبت اور پریشانی میں بھی شوخی، فقرے بازی اور پھبتی کسنے سے باز نہیں رہتے۔

روٹی جب آئی پیٹ میں سو قند گھل گئے ۔۔۔ گلزار پھولے آنکھوں میں اور عیش تل گئے
دو تر نوالے پیٹ میں جب آ کے ڈھل گئے ۔۔۔ چودہ طبق کے جتنے تھے سب بھید کھل گئے
یہ کشف یہ کمال دکھاتی ہیں روٹیاں

(۹) جزئیات نگاری: نظیر اکبرآبادی کی خوبی ان کی جزئیات نگاری بھی ہے۔ وہ معمولی سے معمولی چیزوں کے بیان میں تفصیل سے کام لیتے ہیں۔ یہ صفت اُسی وقت پیدا ہوتی ہے جب شاعر کو جذبات انسانی کا مکمل شعور ہو اور وہ اس کا مطالعہ باریک بینی سے کرتا ہو۔ ان کی جزئیات نگاری کی اہم نظموں میں "آگرہ کی تباہی"، "بلدیو جی کا میلہ" وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے "ریچھ کا بچہ"، "بلبلوں کی لڑائی" وغیرہ پر جو نظمیں لکھی ہیں وہ بھی جزئیات سے بھرپور ہیں۔

مالنوں کا زیادہ ان سے کمال ۔۔۔ ڈال دیں ہار کا گلے میں جال
بدھی ہو کر لیں صاف دل کو نکال ۔۔۔ رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

ناقدین کی آرا:

۱۔ نظیر کے کلام میں آزادہ روی ہے۔ اس کی عام واقفیت اور ہمہ دانی قابلِ تعجب ہے۔ (رام بابو سکسینہ)
۲۔ حقیقی شاعری کے یورپی معیارِ ادب سے نظیر واحد ہندوستانی شاعر ہے۔ (ڈاکٹر فیلن)
۳۔ کوئی مجھ سے پوچھے کہ آگرہ کی وجہ شہرت کیا ہے تو تاج محل کے بعد میں نظیر اکبرآبادی کا نام لوں گا۔ (ڈاکٹر سلیم اختر)
۴۔ ان کی وساطت سے شعر آسمان سے اتر آیا اور زمین کی بو سونگھنے لگا۔ (ڈاکٹر وزیر آغا)

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

۵۔ لفظ گوئی کے تعلق سے نظیر جدید اردو شاعری کے باوا آدام ہیں۔ (ڈاکٹر جمیل جالبی)

۶۔ اردو شاعری کے آسمان پر نظیر اکبر آبادی کی ہستی تنہا ستارے کی طرح درخشاں ہے۔ نظیر کا وجود ہی اردو شاعری کی بے نظیر تنقید ہے۔ (کلیم الدین احمد)

۷۔ نظیر، ہندوستان کا شیکسپیئر اور فطرتی اور قدرتی مضامین کے بیان میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ (منشی سید احمد دہلوی)

۸۔ پورے اردو ادب میں وہی ایک شاعر ہے جو عوام کے ساتھ رہتا، انھیں سمجھتا اور اُن کے تاثرات کو انہیں کی زبان میں بیان کرتا ہے۔ (ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری)

خواجہ حیدر علی آتش

خواجہ حیدر علی آتش نے ۱۷۶۴ء میں ایک صوفی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ والد کی اچانک وفات کے سبب تعلیم کا سلسلہ بھی ادھورا چھوڑنا پڑا لیکن بعد میں ذاتی کوششوں اور مطالعے سے اس کمی کو پورا کیا۔ تلوار بازی میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ یہ وہ دور ہے جب دلی اور لکھنؤ کی مسابقت حد درجے بڑھ گئی تھی اور اہلِ لکھنؤ، رنگِ دلی سے جدا ہونے کے لیے زبان و بیان اور مضامین میں تبدیلی کی شعوری کوششیں کر رہے تھے۔ زبان و بیان کے اس معرکے کے نتیجے میں جنم لینے والی "طرزِ جدید" کے سرخیل ناسخ تھے۔ اس "طرزِ جدید" میں خارجیت اور مصنوعیت، غالب تھی اور دلی جذبات اور سچا عشق دور دور تک نظر نہیں آتے تھے۔ فقط "ظاہری حسن" ہی کو مرکزِ بیان کی حیثیت حاصل تھی۔

لکھنؤ کے اس مصنوعی ماحول میں آتش کا کلام ہی اصل دلی جذبات کی حدت اور اردو شاعری کی قدیم روایتوں کے سانچے میں ڈھلا نظر آتا ہے۔ اگرچہ آتش بھی ابتدا میں اس "طرزِ جدید" کے طوفان میں بہہ گئے تھے لیکن جلد ہی سچی شاعری کی طرف لوٹ آئے۔ اسی جذبہ و احساس اور زندگی سے کشید زندہ تجربوں اور سادہ گوئی پر مبنی شاعری ہی نے ان کو اردو شاعری میں حیاتِ جاوید عطا کر دی ہے:

بلا دیں دل نہ کیوں کر شعرِ آتش　　صفا بندش ہے، معنی خوبصورت

آتش کی شاعری کی چیدہ چیدہ خصوصیات درج ذیل ہیں:

(۱) **ترجمانیٔ عشق:** شاعری کے بدن میں روح اس وقت ہی سماتی ہے جب اس میں سچے عشق کا لہو دوڑتا ہے۔ آتش کے ہاں کیفیاتِ عشق میں بلا کی کیف و سرمستی بسی ہوئی ہے۔ میر کی شاعری ہجر کی شاعری اور آتش کی شاعری وصل کی شاعری ہے۔ میر دلی کی تباہی کے چشم دید گواہ ہیں اور اسی لیے درد و کرب کی فضا میں سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ آتش، لکھنؤ کی تہذیب کو عیش و عشرت کی گود میں آخری سانسیں لیتے ہوئے دیکھتے ہیں اور خود بھی وصل و انبساط کے گیت گاتے ہیں۔ آتش کا محبوب، اردو شاعری کا روایتی محبوب نہیں ہے بلکہ گوشت پوست کی بنی ایک پاکیزہ عورت ہے:

کسی کا ہو رہے آتش کسی کو کر رکھے اپنا　　دو روزہ عمر کو انساں نہ رائگاں کاٹے
ٹھہرے نہ پھر جو راہ میں تیری نکل چلے　　شل ہو گئے جو پاؤں تو ہم سر کے بل چلے

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

(۲) نُدرتِ ادا: آتش کی شاعری ندرتِ ادا کا عالیشان نمونہ ہے۔ انسانی جذبوں کی یکسانیت کو بھی اپنے ادائے نو سے ایک نئے اور متاثر کن احساس کی زبان دیدیتے ہیں اور قاری اس کی مٹھاس ہمیشہ اپنے دل میں محسوس کرتا رہتا ہے:

کسی نے مول نہ پوچھا دلِ شکستہ کا — کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا
پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا — زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

(۳) بے مثل مطلع: کسی بھی غزل میں عموماً مطلع ہی واحد قافیہ بند شعر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا خوب سے خوب تر ہونا بھی انتہائی ضروری ہے کیوں کہ یہ غزل کے تعارف کی حیثیت رکھتا ہے۔ آتش کی غزلوں کے اکثر مطلعے نہ صرف انتہائی خوب صورت ہیں بلکہ غزل کی مجموئی فضا کے ترجمان بھی ہیں:

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا — کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا
مگر اُس کو فریبِ نرگسِ مستانہ آتا ہے — الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے
دل چھٹ کے جاں سے گور کی منزل میں رہ گیا — کیسا رفیق ساتھ سے مشکل میں رہ گیا
بیمار عشق رنج و محن سے نکل گیا — بے چارہ منہ چھپا کے کفن سے نکل گیا
ایک دن فرصت جو میں برگشتہ قسمت مانگتا — دیدۂ تر نوح کے طوفاں کی رخصت مانگتا
چلی ہے ایسی زمانے کی کچھ ہوا الٹی — کہ سیدھی بات سمجھتے ہیں آشنا الٹی

(۴) آتش کی زبان: آتش نے اپنی شاعری میں الفاظ کو اسی طرح برتا ہے جیسا وہ زبان کو سنتے اور بولتے تھے۔ وہ ناسخ کی طرح قواعدِ زبان کے آہنی اصول طے کر کے زبان کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں کیوں کہ اس سے زبان کی فطری خوبصورتی دب کر رہ جاتی ہے۔ آتش، اردو زبان کے وجود اور اس کی شناخت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کے مزاج اور تلفظ کے مطابق ہی عام بول چال کی زبان اور روزمرہ و محاورہ کو اپنے فطری حسن کے ساتھ اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہیں۔ لفظ "بیگم" ترکی میں پیش کے ساتھ یعنی "بیگُم" ہے لیکن آتش نے اسے اردو تلفظ کے مطابق "بیگم" ہی استعمال کیا ہے۔ اسی طرح "مشایعت" کے بجائے "مشیت" استعمال کیا ہے:

عاشق کا جنازہ ہے ملا راہ میں پیارے — تو بھی تو مشیت کوئی دوگام کیے جا

آتش نے ناسخ کے برعکس ہندی الاصل الفاظ کا استعمال بھی ترک نہیں کیا۔ چند مصرعے دیکھیے:

واں	ـــ	بے اجل واں ایک دوہر رات مرجاتا رہا
یاں	ـــ	روح جنت کو گئی جسم گلی یاں رہ گیا
ٹٹ پونجیے	ـــ	اب کرے ٹٹ پونجیے گرم اپنی دکاں داری
ٹھیکرے	ـــ	دو ٹھیکرے ہیں بھیک کے دیدار کے لیے

(۵) محاورات کا استعمال: محاورات کا زیور، زبان کی دلہن کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ محاورات کسی بھی زبان کی صدیوں پر محیط تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی ارتقا کی کہانی بھی سناتے ہیں۔ آتش نے بھی اپنے اشعار میں محاورات کے یہ نگینے خوب ٹانکے ہیں مثلاً:

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

پاؤں ٹوٹنا	۔	پاؤں ٹوٹیں ترے اے عمرِ رواں
پھولے نہ سمانا	۔	یاسمیں باغ میں پھولے نہ سمائی ہوتی
مردے اکھیڑنا	۔	چپ رہیے بس نہ گور کے مردے اکھیڑیے
گھی کے چراغ جلانا	۔	گھی کے چراغ طور کے اوپر جلاؤں میں

(۶) تصوف: آتش کی شاعری میں جہاں سچے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے وہیں گہری فکر بھی تصوف کے پاکیزہ پیراہن میں موجود ہے۔ آتش، تصوف کی راہ میں خواجہ میر درد کی راہ پر چلتے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں صوفیانہ و مابعد الطبیعیاتی اصطلاحات کثرت سے استعمال ہوئی ہیں۔ خدا، کائنات وانسان کے مسائل اوران کے باہمی روابط کو آتش نے گہرے فکری انداز سے پیش کیا ہے۔ تصوف، شعرائے دلی کے کلام میں تو جز ولاینفک کی حیثیت سے تھا لیکن شعرائے لکھنؤ کے کلام میں ناپید تھا۔ صرف آتش ہی کے کلام میں یہ چراغ جلتا نظر آتا ہے:

جسم خاکی کے تلے جسم مثالی بھی ہے — اک قبا اور بھی ہم زیرِ قبا رکھتے ہیں
معرفت میں تیری ذات پاک کے — اڑتے ہیں ہوش و حواس ادراک کے

(۷) بے نیازی اور فقرودرویشی: ہر تخلیق، اپنے تخلیق کار کی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔ آتش کے مزاج میں بے نیازی اور فقرودرویشی بسی ہوئی تھی۔ توکل وقناعت، صبروشکر اور گوشہ نشینی ان کا شعار تھا۔ وہ ایک صاف دل، آزادوضع اور درویش صفت انسان تھے۔ منفعت کے لیے کبھی کسی نواب کے دربار سے وابستہ ہونے کا احسان اٹھانا گوارہ نہیں کیا:

منزلِ فقروفنا جائے ادب ہے غافل — بادشہ تخت سے یاں اپنے اتر لیتا ہے
کروں میں شکر الٰہی کہاں تلک آتش — درون صاف دیا، پاک اعتقاد کی

(۸) اخلاقی موضوعات: آتش کے کلام میں اخلاقی موضوعات کے گوہر نایاب بھی قدم قدم پر دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں انسان کو عملِ پیہم کا درس دیتے ہیں اور کہیں اسے اعلیٰ اخلاقی منصب پر فائز ہونے کی راہ دکھاتے ہیں۔ عظمتِ انسانیت اوراحترامِ انسانیت کے بھولے بسرے سبق کی یاددہانی ان کے ہاں بہت نمایاں ہے۔ فراق گورکھپوری نے کہا تھا کہ آتش توغزل میں ایسے اخلاقی مضامین کا بادشاہ ہے:

ناقص ہے دوست داری میں کامل نہیں ہے تو — دشمن سے بھی غبار اگر دل میں رہ گیا
باراں کی طرح لطف و کرم عام کیے جا — آیا ہے جو دنیا میں تو کچھ نام کیے جا

(۹) ضرب المثل اشعار: آتش کے بے شمار اشعار نے اپنی ان ہی گوناگوں خصوصیات کے سبب اردوزبان میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ آتش ہی وہ شاعر ہیں جن کے سب سے زیادہ اشعار زبان زدِ عام وخاص ہیں اور اپنے تخلیق کار کو، اردوزبان و ادب میں حیاتِ خضر عطا کرتے ہیں:

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا — کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے — میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا
دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے جان پر — دل سے دشمن کی عداوت کا گلا جاتا رہا
بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا
بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے — یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا
مقسوم کا جو ہے سوہ پہنچے گا آپ سے — پھیلایئے نہ ہاتھ، نہ دامن پسارئیے
زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا — بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

ناقدین کی آرا:

"ان کی شاعری میں لکھنؤ کے مزاج اور معاشرے کے روشن اور اچھے عناصر اپنی جملہ لطافتوں سمیت سمٹ آئے ہیں"۔(ڈاکٹر سیّد عبداللہ)

"ان کی افتادِ طبع نے شاعری میں انھیں لکھنؤ کے عام مذاق میں رنگے ہونے کے باوجود ایک انفرادی شان بخشی"۔(ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

"آتش نے اس طرح اشعار کہے جیسے کوئی باتیں کرتا ہے"۔(مولانا محمد حسین آزاد)

مرزا اسداللہ خاں غالب

مرزا اسداللہ خاں غالب، اردو شاعری کے لیے باعثِ فخر ہیں، انھوں نے اپنی فلسفیانہ سوچ اور ہمہ گیر شخصیت کی بنا پر اردو شاعری کو اس طرح نکھارا ہے کہ آنے والے شاعروں کے لیے شعر کہنا مشکل ہو گیا، انسانی جذبات و احساسات کا کون سا ایسا پہلو ہے جس کا عکس غالب کے ہاں نہ ملتا ہو۔ ڈاکٹر بجنوری تو دیوان غالب کو ہندوستان کی الہامی کتابوں میں شمار کرتے ہیں۔

غالب کی شاعری کی چیدہ چیدہ خصوصیات درج ذیل ہیں

(ا) جدت: غالب کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی جدت ادا ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو غالب کو دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ انھوں نے سیدھے سادے خیالات کو بھی اس انداز سے پیش کیا ہے کہ پرانی باتیں بھی نئی معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے شعر جدت بیان کا شاہکار ہیں۔

لاگ ہو تو اس کو سمجھیں ہم لگاؤ — جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد — پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

(۲) ایجاز و اختصار: غالب کی ایک نمایاں خوبی ان کا ایجاز و اختصار ہے۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی سمونا غالب کا کمال ہے۔ درحقیقت وہ دو مصرعوں میں معانی کی ایک دنیا آباد کر دیتے ہیں۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی   اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر   کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

(۳) شوخی وظرافت: حالی نے غالب کو حیوان ظریف کہا ہے، ان کی یہ ظرافت خطوط کے علاوہ اشعار میں بھی اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ وہ اپنے غم کو ظرافت کے پردے میں چھپا کر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ کبھی وہ اپنے آپ پر، کبھی معاشرے پر اور کبھی کبھی خدا کو بھی اپنی شوخی کا نشانہ بنا دیتے ہیں۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق   آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا؟

• چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد   آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

(۴) فلسفیانہ خیالات: غالب نے روایت سے ہٹ کر فلسفیانہ خیالات اپنے اشعار میں بیان کیے ہیں۔ وہ کائنات کو ایک فلسفی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور حادثات اور واقعات کی تعبیر فلسفیانہ انداز میں کرتے ہیں۔

لالہ و گل کہاں سے آئے ہیں   ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد   عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

(۵) انسانی نفسیات: غالب انسانی نفسیات پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں چوں کہ ان کو خود بھی بہت سی مشکلات سے گزرنا پڑا، مختلف حالات و واقعات ان کو پیش آئے اس لیے ان کی شاعری میں ہمیں زندگی کے تجربات کا عکس ملتا ہے، غالب نے اپنی ذہانت سے انسانی نفسیات کے پوشیدہ گوشوں کو عمدگی سے اُجاگر کیا ہے۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں   موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج   مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

(۶) سوز وگداز: غالب کے کلام میں سوز وگداز کی ایک لطیف سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کی ساری زندگی پریشانیوں میں گزری لیکن اس کے باوجود وہ انتہائی دکھ کے عالم میں بھی جذبے کو عقل کے قابو میں رکھتے ہیں، حادثات کو انتہائی دکھ کے عالم میں بھی جذبے کو عقل کے قابو میں رکھتے ہیں۔ حادثات کو برداشت کرنا ان کا عقیدہ ہے۔ ان کے رونے میں بھی ایک وقار ہے۔

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی   اب کسی بات پر نہیں آتی

درد ہو دل میں تو دوا کیجے   دل ہی جب درد ہو تو کیا کیجے

(۷) لفظی صناعی: غالب معنوں کے ساتھ ساتھ الفاظ کی تراش خراش میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کی تراکیب، تشبیہات اور استعارات نہایت اچھوتی ہوتی ہیں۔

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر   لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں   سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

(۸) پہلوداری: غالب کی اس خصوصیت کا ذکر حالی نے تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ یعنی غالب کے متعدد اشعار ایسے ہیں کہ پہلی نظر

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

میں ان کے کچھ اور معنی سمجھ میں آتے ہیں لیکن غور کرنے پر ایک دوسرے لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ۔۔۔ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے ۔۔۔ کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

(۹) سہلِ ممتنع: غالب کا ابتدائی کلام نہایت مشکل ہے۔ مرزا بیدل کی تقلید میں غالب نے مشکل پسندی سے آغاز کیا لیکن بعد میں جب وہ سادگی کی طرف آئے تو اس میں بھی سہلِ ممتنع کے شاندار نمونے پیش کیے۔

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید ۔۔۔ جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
کوئی امید بر نہیں آتی ۔۔۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی

(۱۰) تصوف: غالب صوفی تو نہ تھے مگر انھوں نے تصوف کے معاملات کو اپنے اشعار میں جا بجا بیان کیا ہے۔ وہ ان معاملات کو ایک صوفی ہی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ۔۔۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ۔۔۔ ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ناقدین کی آراء:

عہدِ مغلیہ نے ہندوستان کو تین چیزیں عطا کیں۔ تاج محل اردو زبان اور غالب (رشید احمد صدیقی)
اردو غزل میں غالب ایک نیا خیال، ایک نیا گوشۂ فکر اور ایک نیا شعور ہیں (آل احمد سرور)
غالب ایک فرد نہیں ایک نسل ہے (فیض احمد فیض)
غالب کم از کم اردو شاعری میں ایک نیا رہنما اور دیوان غالب اردو کا نیا موڑ ہے (مجنوں گورکھ پوری)
مرزا غالب کے آتے ہی اردو شاعری کفِ دست پر ٹھوڑی رکھے غرقِ حیرت ہوگئی (ڈاکٹر خورشید الاسلام)
غالب اپنے عصر کا آئینہ ہی نہ تھا بلکہ اپنے طرزِ احساس کی بناہ پر وہ ہمارا ہم عصر بھی بن جاتا ہے (ڈاکٹر سلیم اختر)

حرفِ آخر: غالب نہ صرف اپنے دور کا بلکہ اپنے بعد آنے والے تمام ادوار کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری کے نئے نئے پہلو دریافت ہوتے رہیں گے اور اردو شاعری کے وقار میں اضافہ کرتے رہیں گے۔

مرزا داغ دہلوی

نواب مرزا خاں نام اور داغ تخلص تھا۔ ۲۵ مئی ۱۸۳۱ کو دہلی میں پیدا ہوئے، چھ سال ہی کے تھے کہ والد نواب شمس الدین خاں کا انتقال ہوگیا۔ آپ کی والدہ نے بہادر شاہ ظفر کے بیٹے مرزا فخرو سے شادی کر لی۔ اس طرح داغ کی پرورش قلعہ میں ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر اور مرزا فخرو دونوں ذوق کے شاگرد تھے۔ لہٰذا داغ کو بھی ذوق سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔ داغ کی زبان بنانے اور سنوارنے میں ذوق کی تربیت کا بڑا دخل ہے۔ بعد نواب کلب علی خان نے داغ کی قدردانی فرمائی اور باقاعدہ ملازمت دے کر اپنی

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

مصاحبت میں رکھا۔نواب کلب علی خان کی وفات کے بعد داغ نے حیدر آباد دکن کا رخ کیا۔ نظام دکن کی استادی کا شرف حاصل ہوا۔ دبیرالدولہ۔ فصیح الملک،نواب ناظم جنگ بہادر کے خطاب ملے۔ ۱۹۰۵ میں وفات پائی۔ داغ کے شاگردوں میں علامہ اقبال، جگر مراد آبادی، سیماب اکبرآبادی اوراحسن مارہروی جیسے معروف شاعروں کوان کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ان کے جانشین نوح ناروی بھی معروف شاعر ہیں۔

(۱) زبان کے بادشاہ: داغ اردو زبان کے بادشاہ ہیں۔ان کے کلام میں سلاست، صفائی، سحر آفرینی، رنگینی، شوخی، زبان کا چٹخارا، چلبلاہٹ پائی جاتی ہے۔داغ نے اردو زبان کو انتہائی عروج پر پہنچایا۔

تھے کہاں رات کو آئینہ تو لے کر دیکھو　　　اور ہوتی ہے خطاوار کی صورت کیسی

(۲) حسن بیان: داغ کی سب سے بڑی خوبی ان کا حسن بیان ہے۔انھوں نے شاعری کو پیچیدہ ترکیبوں، فارسی اور عربی کے غیر مانوس الفاظ سے بچانے کی کوشش کی اور سیدھی سادھی زبان میں واقعات اور محسوسات کو بیان کیا۔اس وجہ سے ان کا کلام تصنع اور بناوٹ سے خالی ہے۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ　　　سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے
نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو　　　کہ آتی ہے اردو زبان آتے آتے

(۳) انفرادیت: داغ نے اپنے ہمعصر شعراء کی پیروی نہیں کی بلکہ اپنی الگ راہ سخن اور طرز گفتار اختیار کی۔ جو انھیں دوسرے شعرا سے منفرد رکھتی ہے:

یہ کیا کہا کہ داغ کو پہچانتے نہیں　　　وہ ایک ہی تو ہے سارے جہاں میں

(۴) صاف گوئی: داغ صاف بات کرنے کے عادی ہیں وہ اپنے دل کی بات واضح طور پر سامنے لاتے ہیں اور سادگی اختیار کرتے ہیں۔اس سادگی اور صاف گوئی کی مثالیں جابجا داغ کی شاعری میں نظر آتی ہے۔مثلاً:

ہم ساتھ ہو لیے تو کہا اُس نے غیر سے　　　آتا ہے کون اس سے کہو یہ جدا چلے

(۵) حق گوئی: داغ کا ظاہر و باطن ایک ہے اور اُن کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ وہ عملی زندگی میں جو کچھ کرتے ہیں اس پر شرمندہ نہیں ہوتے اور اس کا شاعری میں برملا اظہار کرتے ہیں:

غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا　　　تمام رات قیامت کا انتظار کیا

(۶) مکالمہ نگاری: داغ کی شاعری میں مکالمہ نگاری کو اہمیت حاصل ہے۔ وہ اشعار اس طرح کہتے ہیں جیسے کسی کو سامنے بٹھا کر باتیں کر رہے ہوں۔ یہ ان کی بہت بڑی خوبی ہے۔مثلاً:

خدا کے واسطے جھوٹی نہ کھایئے قسمیں　　　مجھے یقین ہوا مجھ کو اعتبار آیا

(۷) ترنم اور موسیقیت: داغ کی غزلوں کی پسندیدگی میں اس کے ترنم اور موسیقیت کو اہمیت حاصل ہے۔غزلوں کے ردیف اور قافیے کی تلاش میں ان کو کمال کا عبور حاصل ہے۔ اُن کے ہاں الفاظ کا استعمال نہایت برمحل اور برجستہ ہے۔داغ غیر ضروری الفاظ سے

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

پرہیز کرتے ہیں بیان کی شوخی، بے تکلفی، طنز، جذبے کی فروانی اور تجربہ ومشاہدہ کی کثرت سے ان کی غزلیں بھرپور ہیں۔ مثلاً:

ابھی ہماری محبت کسی کو کیا معلوم　　　کسی کے دل کی حقیقت کسی کو کیا معلوم

(۸) زبان دہلی کا استعمال: داغ نے لال قلعے میں پرورش پائی اور دہلی کی گلی کوچوں میں جوان ہوئے۔ اس لیے داغ اپنی شاعری میں زبان دہلی کا استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مستند اہل زباں خاص ہے دہلی والے　　　اس میں غیروں کا تعرف نہیں مانا جاتا

(۹) داغ کی شاعری کا محور: داغ کی شاعری صرف ایک محور پر گردش کرتی ہے اور وہ ہے عشق۔ مومن کی طرح ان کے ہاں بھی نفسیاتی بصیرت کا اظہار جگہ جگہ ملتا ہے۔ مثال کے طور پر کہتے ہیں:

رخ روشن کی آگے شمع رکھ کے وہ یہ کہتے ہیں　　　ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

(۱۰) جذبات کا شاعر: داغ نہ فلسفی تھے اور نہ کوئی بڑا نظریہ حیات رکھتے تھے وہ صرف شاعر تھے اور وہ بھی جذبات اور شوخی کے شاعر اُنھوں نے اپنی شاعری میں جذبات کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ مثلاً:

تم اپنے ساتھ ہی تصویر اپنی لے جاؤ　　　نکال لیں گے کوئی اور مشغلہ دل کا

(۱۱) معاملہ بندی: داغ کی معاملہ بندی انشاء، رنگین اور جرات کی طرح نہیں ہے وہ داغ کی اپنی ہے جس میں بے تکلفی اور سچائی ہے اور تصنع اور بناوٹ سے بالکل خالی ہے مثال کے طور پر وہ کہتے ہیں:

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک　　　مٹی کی ملے تو روا ہے شباب میں

(۱۲) زبان اور شاعری پر ناز: داغ زبان و بیان اور فصاحت کے علمبردار شاعر ہیں اس لیے وہ اپنی زبان اور شاعری پر ناز کرتے ہیں۔ اُن کی اس شاعرانہ تعلی کی مثالیں اُن کی شاعری میں جابجا موجود ہیں۔

داغ سا بھی کوئی شاعر ہے ذرا سچ کہنا　　　جس کے ہر شعر میں ترکیب نئی بات نئی

(۱۳) ناصح، واعظ اور رقیب: داغ کے ہاں ناصح، واعظ اور رقیب کے لیے اچھوتے قسم کے مضامین ملتے ہیں عام طور پر شعراء نے ناصح، رقیب اور واعظ کے ساتھ نت نئے انداز میں چھیڑ چھاڑ کی ہے لیکن داغ نے ان کے دلوں کو ٹٹول کر ہمدردی اور افسوس کا اظہار بھی کیا ہے۔ مثلاً:

وہ اس ادا سے وہاں جا کے شرم سار آیا　　　رقیب پر مجھے بے اختیار پیار آیا

اہلِ علم کی آرا:

بقول فراق گورکھپوری: "اردو شاعری نے داغ کے برابر کا فقرہ باز آج تک پیدا کیا ہے اور نہ آئندہ پیدا کر سکے گی۔"

بقول رام بابو سکسینہ: "ان کی زبان کے ساتھ اس خدمت کی ضرور قدر کرنی چاہیے کہ انہوں نے سخت اور معلق الفاظ ترک کیے اور سیدھے الفاظ استعمال کیے۔ جس سے کلام میں بے ساختگی اور فصاحت مزید بڑھ گئی ہے۔"

بقول خلیل الرحمن عظمی: "داغ کے طرز بیان میں جو صفائی اور فصاحت، جو چستی، جو نکھار، جو البیلا پن اور جو فنی رچاؤ ملتا ہے وہ بہت کم غزل گویوں کے حصے میں آیا ہے۔ داغ کا فن اُن کی شخصیت کی ایک تصویر ہے اس لیے اس میں بڑی جان ہے۔"

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

شاعر مشرق علامہ اقبال

ترجمانِ حقیقت، حکیم الامت، ڈاکٹر سر علامہ محمد اقبال اردو شاعری کے تاج کا سب سے بڑا ہیرا ہیں، ان کی شاعری ایک درس عمل، ایک پیغام، ایک دعوت فکر ہے، جس میں زبان و بیان کا حسن طرزِ ادا کی جدت اور شعری محاسن اعلیٰ پیمانے پر موجود ہیں، ان کے خیالات کی سطح انتہائی بلند، کلام میں بے پناہ اثر اور روانی ہے، زبان پر انھیں مکمل عبور ہے۔ تراکیب اور تشبیہات کے بادشاہ ہیں۔ انھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ مقصدیت کے تحت بھی اعلیٰ شاعری ممکن ہے، شاعروں کی آنے والی کئی نسلیں اقبال کے اثرات سے آزاد نہیں ہو سکیں گی۔

اقبال کی شاعری کی چیدہ چیدہ خصوصیات درج ذیل ہیں

(۱) عشق رسول ﷺ: اقبال کی شاعری اور سوچ کا محور آنحضرت ﷺ کی ذات اور اسوۂ حسنہ ہے۔ ان کی فکر و نظر کے زاویے سرور کائنات ﷺ کی محبت سے تپش، سوز اور نکھار حاصل کرتے ہیں۔ وہ باقاعدہ نعت گو شاعر نہیں مگر حضور ﷺ کے پیکر نے ان کے کلام کو سراپا نعت بنا دیا ہے۔

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب — گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے — دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

(۲) وطنیت: اقبال شروع میں ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ اس لیے ان کی ابتدائی شاعری میں وطن سے محبت کا جذبہ نظر آتا ہے۔ اس زمانہ میں اقبال نے ہندوستانی ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا لکھا" اس کے بعد وہ مشہور نظم "ہمالہ" بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ اس دور کی شاعری میں اس قسم کے اشعار عام ملتے ہیں۔

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے — تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والوں — تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

(۳) وطن پرستی کی مخالفت: یورپ سے واپسی پر اقبال کے خیالات میں تبدیلی رونما ہوئی۔ اب انھوں نے جغرافیائی حدود سے بالاتر ہو کر دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع ہونے کا پیغام دیا اور "اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے" کا نعرہ بلند کیا۔ وہ وطنیت کو مسلمانوں کے انتشار کا سب سے بڑا سبب بتاتے ہیں۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے — قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

(۴) فلسفۂ خودی: "جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا" اقبال نے اس نظریے کے تحت اپنا فلسفۂ خودی پیش کیا۔ اقبال کے نزدیک خودی عرفان ذات کا دوسرا نام ہے۔ دنیا میں آنے کے بعد ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے وجود اور اپنی ذات کی حقیقت کو سمجھے اور کائنات سے اپنے تعلق کی نوعیت پر غور کرے، اقبال کے فلسفۂ خودی کا سرچشمہ قرآن پاک ہے۔ وہ کہتے ہیں ''خودی کا

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

سرنہاں لا الٰہ الّا اللہ'' ان کے نزدیک کائنات اور انسان کی تخلیق کا راز خودی میں پوشیدہ ہے۔

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے بیداری کائنات
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو رُوسیاہی — تری زندگی اس سے تری آبرو اس سے

(۵) مردِ مومن کا تصور: اقبال کا مردِ مومن وہ انسان ہے جو اپنی خودی سے آگاہ ہے۔ جو اسلامی شعار اور اعلیٰ انسانی صفات کا مالک ہے۔ وہ ہر وقت رضائے الٰہی کا پابند ہے۔ دشمنوں کے لیے فولاد سے زیادہ سخت اور دوستوں کے لیے ریشم سے بھی زیادہ نرم ہوتا ہے۔ ہر وہ عظیم انسان ہے کہ اسے جس طرح اور جس رخ سے بھی دیکھیں تو اللہ کی شان نظر آتی ہے۔ وہ اللہ کے وجود کی روشن دلیل ہے۔ وہ کلام الٰہی کا جیتا جاگتا عملی نمونہ ہے۔

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زورِ بازو کا — نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

(۶) عقل اور عشق کی کش مکش: اقبال کی شاعری میں فلسفہ خودی ہر جگہ چھایا ہوا ہے۔ مگر خودی کی تعمیر کے لیے عشق یعنی اپنے مقصد سے سچی لگن انتہائی ضروری ہے۔ اس لیے اقبال کے ہاں عقل اور عشق کی کشمکش جاری رہتی ہے۔ وہ عشق کو وسیع معنوں میں استعمال کرتے ہیں ان کے نزدیک عشق ہی وہ جذبہ ہے جس کی وجہ سے انسان میں فکر و عمل کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر عشق کی آگ بجھ جائے تو مسلمان راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ اسی لیے وہ جگہ جگہ عشق کی اہمیت پر زور دیتے نظر آتے ہیں۔

عشق دم جبرئیل ، عشق دلِ مصطفیؐ — عشق خدا کا رسولؐ، عشق خدا کا کلام
صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق — معرکۂ وجود میں، بدر و حنین بھی ہے عشق

(۷) فلسفیانہ تخیل کی بلندی: تخیل کی بلندی میں اقبال اردو کے تمام شاعروں سے سبقت لے گئے ہیں۔ وہ حیات و کائنات کے معاملات پر باریک بینی سے غور کرتے ہیں۔ وہ غالب کی طرح محض سوال نہیں اٹھاتے بل کہ ان سوالات کا حل بھی پیش کرتے ہیں۔ وہ ایک نظامِ زندگی کا واضح تصور رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جذبے کی شدت کے ساتھ ساتھ فکر کی گہرائی بھی موجود ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید — کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں
عروجِ آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں — کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

(۸) سوز و گداز: اقبال کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت اس کا سوز و گداز ہے۔ وہ خود بھی مسلمانوں کی حالت پر روتے ہیں اور دوسروں کو بھی رُلاتے ہیں۔ مسلمانوں کی ذلت اور بے عملی پر ان کا دل کڑھتا رہتا ہے، سوز و گداز کی یہ کیفیت ویسے تو ان کی پوری شاعری میں موجود ہے تاہم ان کی نظموں "حضور رسالت مآبؐ "، "گورستان شہی"، "تصیر درد" اور "صقلیہ" وغیرہ میں یوں لگتا ہے کہ اقبال کا دردِ دل قلم کی نوک پر آ گیا ہے۔

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے — سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری
رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونناب بار — وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

(۹) رجائیت: اقبال کو اپنی قوم کی بے حسی پر افسوس تو ضرور ہے مگر وہ اپنی قوم خصوصاً نوجوانوں سے مایوس ہرگز نہیں ہیں، وہ امید کے پیغمبر ہیں۔ زندگی کی مشکلات پر رونے دھونے کے بجائے وہ ان سے مقابلے کا پیغام دیتے ہیں اور مسلسل جدوجہد کی تلقین کرتے ہیں۔ نوجوانوں کو وہ شاہین سے تشبیہ دیتے ہیں۔

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول — لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے — ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

(۱۰) شاعرانہ مصوری: اقبال کے کلام کی نمایاں خصوصیات میں ایک ان کی شاعرانہ مصوری ہے۔ وہ مناظر فطرت کی لفظی تصویریں بڑی خوبصورتی سے کھینچتے ہیں، زبان پر انھیں مکمل عبور ہے، کسی بھی منظر کے بیان میں وہ ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ پورا منظر زندہ ہو کر نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ ان کی اکثر نظمیں منظر کشی کا شاہکار ہیں۔

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں — ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی — جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

(۱۱) تشبیہات اور استعارات کی دلکشی: تشبیہ کو کلام کا زیور کہا جاتا ہے اور اقبال انوکھی اور جدید تشبیہات سے اپنے کلام کا حسن دوبالا کرنے کا فن اچھی طرح جانتے ہیں ویسے تو ان کے کلام میں تشبیہات ہر جگہ اپنا اثر دکھاتی ہیں مگر جو کیفیت ان کی نظم "جگنو" میں پیدا ہوتی ہے وہ ان کے فنی کمال کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

جگنو کی روشنی ہے کاشانہ چمن میں — یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ — یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

(۱۲) موسیقیت اور ترنم: اقبال کے اشعار میں موسیقی اور ترنم کی ایک خاص کیفیت پائی جاتی ہے اس مقصد کے لیے وہ عام طور پر رواں اور ترنم بحروں کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان بحروں میں حسین الفاظ اور عمدہ تراکیب کے امتزاج سے موسیقیت پیدا ہوجاتی ہے۔ ان کے الفاظ اور مصرعے سُر اور تال کا کام دیتے ہیں۔

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا — میں ہلاک جادوئے سامری، تو قتیل شیوۂ آزری
وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی — مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی

ناقدین کی آراء:

آل احمد سرور کہتے ہیں "اقبال نئی شرقیت کی آواز ہیں"

سردار جعفری کی رائے میں "اقبال کے تصورات نے اردو شاعری کو ایک نئی سطح پر پہنچا دیا ہے"

پروفیسر وقار عظیم لکھتے ہیں "اقبال کی غزل شاعری کی نئی آواز ہے"

ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں "اقبال جدید اردو نظم کے اوّلین علم بردار ہیں"

حرف آخر: حرف آخر کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقبال کی شاعری ایک درس عمل، ایک پیغام ہے۔ اس میں حرکت و عمل کا وہ نمونہ ہے

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

جس نے شاعری کا مزاج ہی بدل دیا ہے۔ انھوں نے موضوع اور زبان دونوں کے لحاظ سے وسعت پیدا کی ہے۔ الغرض اقبال ایک عہد آفرین شاعر کی حیثیت سے اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

حسرت موہانی

سید فضل الحسن نام اور حسرت تخلص تھا۔ ضلع اناؤ (یوپی) کے ایک قصبے موہان میں ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ حسرت نے ابتدائی تعلیم مکتب میں حاصل کی۔ ۱۸۹۵ء میں فتح پور ہسوہ سے میٹرک کیا۔ اس کے بعد علی گڑھ چلے گئے جہاں ۱۹۳۰ء میں بی اے پاس کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے سرکاری نوکری کے بجائے ایک ادبی رسالہ "اردو معلیٰ" نکالا جس میں ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ سیاسی مضامین بھی ہوتے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں "اردو معلیٰ" میں شائع ہونے والے ایک مضمون کی وجہ سے انھیں دو سال تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ ۱۹۱۶ء میں پھر حسرت دوبارہ گرفتار کر لیے گئے۔ آزادی کی تحریک کے دوران انھیں کئی بار جیل جانا پڑا۔ حسرت نے انتہائی سادہ زندگی گزاری۔ ۱۹۵۱ء میں ان کا انتقال لکھنؤ میں ہوا۔

رئیس المتغزلین حسرت موہانی نے اردو غزل کا اس وقت ہاتھ پکڑا جب ترقی پسندی کے جوش میں بعض حضرات سرعام غزل کی گردن مارنے کی باتیں کر رہے تھے۔ شعراء کے طبقے میں حسرت جیسا کھرا، بے باک اور بے ریا شخص مشکل سے ملتا ہے۔ انھوں نے غزل میں دہلی اور لکھنؤ کی زندہ اور صالح خصوصیات کو اپنے کلام میں اس طرح شیر و شکر کیا کہ دونوں مدرسوں کا فرق ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ ان کی غزل میں شریفانہ معاملہ بندی، احترام حسن و عشق، رجائیت، موسیقیت اور سیاست کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان کی زبان سادہ اور سلیس ہے اور اس میں ایک گھلاوٹ، گداز اور نغمگی ہے۔ عاشقانہ جذبات کا شائستہ اظہار حسرت کے علاوہ کم شاعروں کو نصیب ہوا ہے۔

حسرت کی شاعری کی چیدہ چیدہ خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں

(۱) احترام حسن و عشق: حسرت نے عشق و محبت کے نازک اور لطیف جذبات اور ان کے اتار چڑھاؤ کی تصویریں بھرپور انداز میں کھینچی ہیں۔ لیکن ان کا اظہار باوقار پیرائے میں کیا ہے کیونکہ وہ حسن اور عشق دونوں کی حرمت کے قائل ہیں۔ نہ وہ خود ذلیل ہوتے ہیں اور نہ حسن کو ذلیل کرتے ہیں۔ یہ تہذیب یہ رکھ رکھاؤ حسرت کا خاص انداز ہے۔

دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا
یہ بھی آداب محبت نے گوارا نہ کیا ان کی تصویر بھی آنکھوں سے لگائی نہ گئی

(۲) معاملہ بندی: حسرت کے ہاں جرأت کی معاملہ بندی بھی ملتی ہے مگر وہ جرأت کی طرح فحش گوئی پر نہیں اترتے اور معاملہ بندی میں بھی مومن کی طرح اعتدال اور توازن برقرار رکھتے ہیں۔

کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے
مجھے گرم نظارہ دیکھا تو ہنس کر وہ بولے کہ اس کی اجازت نہیں ہے

(۳) سوز وگداز: غزل میں سوز وگداز ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حسرت کا کلام اس خصوصیت سے مالا مال ہے۔ وہ اپنے درد کو شعر میں ڈھال کر اس طرح سموتے ہیں کہ پڑھنے والا اپنا درد سمجھتا ہے۔ تاہم اس میں میر جیسی چبھن نہیں ہے۔

اثر ایسا کہاں لاؤں یا رب نالۂ دل میں — جو اس بے مہر کو بھی رازِ غم سے آشنا کر دے
بے پر و بال کہاں چھوٹ کے جائیں صیاد — ہم اسیران وفا کیش کو آزاد نہ کر

(۴) تغزل: حسرت کے کلام کی نمایاں خصوصیت اس کا تغزل ہے۔ ان کی غزل سے تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کے گہرے مطالعے سے کلاسیکی روایات کو برقرار بھی رکھا ہے اور اسے سچ بولنا بھی سکھایا ہے۔ بقول مجنوں گورکھ پوری "حسرت نے غزل کی نرم و نازک فطرت کو خوب سمجھا ہے"

توڑ کر عہد کرم ناآشنا ہو جائیے — بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے
بڑھ گئی تم سے تو مل کر اور بھی بے تابیاں — ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

(۵) سلاست وروانی: حسرت کی ایک خوبی ان کی سادگی بھی ہے۔ وہ ہر بات اور جذبے کو سیدھے سادے اور رواں اسلوب میں اس طرح کہتے ہیں کہ دل جھوم اٹھتا ہے۔

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی — مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
وہ شرمائے بیٹھے ہیں گردن جھکائے — غضب ہو گیا اک نظر دیکھ لینا

(۶) ترنم: حسرت کی شاعری موسیقی اور ترنم کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ ان کی غزلیں موسیقی کے رسیلے بول معلوم ہوتی ہیں۔ اور جب بھی گائی جائیں تو جذبات کے ساکن سمندر میں طوفان برپا کر دیتی ہیں۔

ستم ہو جائے تمہید کرم ایسا بھی ہوتا ہے — محبت میں بتا اے ضبطِ غم ایسا بھی ہوتا ہے
محفوظ ہے سب راز ترے لطف و کرم کا — اغیار سے چرچا نہ کیا ہے نہ کریں گے

(۷) بیان کی شگفتگی: حسرت کا کلام بیان کی شگفتگی کا ایک نادر نمونہ ہے۔ قید و بند کی صعوبتوں کے باوجود ان کے لہجے کی شگفتگی برقرار رہتی ہے۔ وہ پرانی باتوں کو بھی اتنے شگفتہ انداز میں کہتے ہیں کہ وہ نئی معلوم ہوتی ہیں۔

عرض کرم پہ ترک جفا بھی نہ کیجیے — ایسا نہ ہو کہ آپ ملا بھی نہ کیجیے
ہم نہ کہتے تھے بناوٹ ہے یہ سارا غصہ — ہنس کے لو پھر وہ انھوں نے ہمیں دیکھا دیکھو

(۸) سیاسی رنگ: اگرچہ حسرت کی شاعری پر عشق و محبت کا رنگ غالب ہے۔ مگر ان کی سیاسی دلچسپیوں اور مشاغل کی بنا پر ان کی شاعری میں کہیں کہیں سیاسی رنگ بھی آ گیا ہے اور قید کی مشکلات کی جھلک بھی اس میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اچھا ہے اہل جور کیے جائیں سختیاں — پھیلے گی یونہی شورشِ حُبِ وطن تمام
فکر احباب کو ناحق ہے رہائی کا خیال — اور ہی کچھ ہے تمنا ترے زندانی کی

(۹) رجائیت: حسرت کے ہاں قنوطیت نہیں ہے۔ ان کا دل بھی غم کے تیر سے گھائل ہوتا ہے۔ لیکن یہ غمِ عشق ہے جو اپنے اندر نشاط

کے سارے انداز چھپائے ہوئے ہے۔ محبوب کی قربت کا احساس اور کامیابی کی امید حسرت کو مایوس نہیں ہونے دیتی۔ اس طرح وہ مریضانہ غم پسندی کا شکار ہونے سے بچ جاتے ہیں۔

قوت عشق بھی کیا شے ہے کہ ہو کر مایوس — جب کبھی گرنے لگا ہوں تو سنبھالا ہے مجھے
ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی — مجھے وہ شامل ارباب امتیاز کرے

(۱۰) عارفانہ رنگ: حسرت کی زندگی درویشانہ بل کہ قلندرانہ قسم کی تھی۔ وہ تصوف کو مذہب کا جزو سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کے کلام میں تصوف کی چاشنی بھی ملتی ہے۔

ہم کیا کریں نہ تیری اگر آرزو کریں — دنیا میں اور کوئی بھی تیرے سوا ہے کیا
عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے — مہر ذروں کو کیا قطروں کو دریا کردیا

(۱۱) مسلسل غزلیں: حسرت کے ہاں بہت سی ایسی غزلیں بھی ہیں جن میں خیال کی وحدت اور مضمون کا تسلسل ہے۔ یہ وہ غزلیں ہیں جن میں حسرت نے محبت کے امور بیان کیے ہیں اور عشق و عاشقی کے زمانے کو یاد کر کے آنسو بہائے ہیں۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے — ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے
بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں — الٰہی ترک الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

(۱۲) عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم: حسرت نے عشق نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوب کر بڑی خوبصورت نعتیں کہی ہیں۔ ان نعتوں میں ان کا خلوص اور جذبہ ایمانی اور عقیدت پوری طرح نمایاں ہے۔

پھر آنے لگیں شہر محبت کی ہوائیں — پھر پیش نظر ہوگئیں جنت کی فضائیں
ہاتھ آئے اگر خاک ترے نقش قدم کی — سر پر کبھی رکھیں کبھی آنکھوں سے لگائیں

ناقدین کی آرا:

حسرت نے غزل کی نرم و نازک فطرت کو خوب سمجھا ہے۔ (مجنوں گورکھ پوری)

جس طرح میر کا عشق فقیرانہ، غالب کا عشق امیرانہ تھا اسی طرح حسرت کا عشق شریفانہ تھا۔ (ڈاکٹر یوسف حسین خان)

حسرت کی آواز میں ترنم، لہجے میں نرمی اور بے ساختگی ہے۔ (کلیم الدین احمد)

حسرت اردو غزل کی تاریخ میں سب سے بڑے مقلد ہیں لیکن انھوں نے تقلید کو تخلیق بنا دیا۔ (فراق گورکھ پوری)

غزل کو لکھنؤ کے تصنع اور غالب کی مشکل گوئی کے کوچے سے سادگی، آسان گوئی اور حقیقت کی منزل تک پھیلانا شاعری میں حسرت کا تجدیدی کارنامہ ہے۔ (علامہ سید سلیمان ندوی)

یہ کہنا ایک حد تک صحیح ہے کہ غزل میں سیاسی رنگ کا اضافہ حسرت نے سب سے پہلے کیا (احتشام حسین)

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

حرف آخر: ہم کہ سکتے ہیں کہ اردو غزل کی نئی نسل کی ابتدا حسرت سے ہی ہوئی ہے۔ ان کی حیثیت ماضی کو حال سے ملانے والی ایک کڑی کی ہے۔ انھوں نے دہلی اور لکھنؤ اسکول کی زندہ اور صالح خصوصیت کو قبول کر کے اپنے کلام کو بیان کی شگفتگی، خیال کی جولانی، عشق کی رنگینی، حسن کی رعنائی اور سوز و گداز کا حسین مرقع بنا دیا ہے۔

منیر نیازی

منیر نیازی اپریل ۱۹۲۸ء میں مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کا لڑکپن بہاولپور میں گزرا۔ بعد میں خاندان کے ساتھ ساہیوال اور پھر لاہور آ گئے۔ وہ صحافت اور فلم سے بھی وابستہ رہے۔ انھوں نے متعدد فلموں کے نغمات بھی تحریر کیے جو بے حد مقبول ہوئے۔ حکومتِ پاکستان نے انھیں صدارتی ایوارڈ اور ستارۂ امتیاز سے بھی نوازا۔ دسمبر ۲۰۰۶ء میں انھوں نے وفات پائی۔ منیر نیازی کی تخلیقات میں تیز ہوا اور تنہا پھول، جنگل میں دھنک، دشمنوں کے درمیان شام، ماہِ منیر اور دوسرے شعری مجموعے شامل ہیں۔

(۱) تازہ کاری: منیر نیازی ان شعرا میں سے ہیں جن کی شاعری اور افکار و خیالات نے نہ صرف اپنے ہم عصر لکھنے والوں کو متاثر کیا، بلکہ بعد کی پوری نسل بھی کسی نہ کسی طرح متاثر ہوئی۔ شاعری میں ان منیر نیازی کا لہجہ تازہ، نادر اور یکتا ہے۔ ان کے خیالات کی ندرت اور انوکھا طرزِ احساس انھیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتا ہے۔

چاند چڑھتا دیکھنا ہے بے حد سمندر پر منیرؔ
دیکھنا پھر بحر کو اس کی کشش سے جاگتا

(۲) امیجری: منیر نیازی نے اردو شاعری میں نئی اور جاندار امیجری کا اضافہ کیا ہے۔ ان کی امیجری ان سے پہلے نظر نہیں آتی۔ انھوں نے غزل اور نظم دونوں میں بڑی ہی خوب صورتی سے امیجری نبھائی ہے۔

دھوپ ہے اور زرد پھولوں کے شجر ہر راہ پر
اک ضیائے زہر سب سڑکوں کو پیلا کر گئی
کھوہ کے باہر سبز جھروکا اس کے پیچھے چاند ہے
جس کی صاف کشش کے آگے رنگ زمیں کا ماند ہے

(۳) روایت شکنی: منیر نیازی نے اپنی راہ آپ بنائی ہے۔ اس عمل میں انھوں نے روایت شکنی سے کام لے کر اجتہاد کی راہ اختیار کی۔ انھوں نے شاعری کو زندگی کے ایک نئے فلسفۂ حیات سے ہمکنار کر دیا اور حیرتوں بھری دنیا کی حیرتوں کو اپنے انداز اور اسلوب سے ہماری حیرتیں بنا کر پیش کیا۔

یہ تو ابھی آغاز ہے جیسے اس پہنائے حیرت کا
آنکھ نے اور سنور جانا ہے، رنگ نے اور نکھرنا ہے

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

(۴) طلسماتی علامتوں کا استعمال: منیر نیازی کی شاعری میں محبت، نفرت، دہشت اور حیرت زندہ اور زندگی بخش ہے۔ وہ طلسماتی علامتوں کے استعمال سے انسانی مصائب و آلام کو دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ وہ کائنات کے ہر مظہر کو انسانی حیرتوں اور دہشتوں بھرے جذبات سے متعین کرتے ہیں۔

دبی ہوئی زیرِ زمین اک دہشت گنگ صداؤں کی
بجلی سی کہیں لرز رہی ہے کسی چھپے تہ خانے میں

(۵) ملال کی کیفیت: منیر نیازی کے کلام میں حیرتوں، دہشتوں اور دیومالائی شعور کے باوجود مسلسل ایک ملال کی کیفیت موجود ہے۔ یہ ملال ان سے اعلیٰ تخلیق کرواتا چلا جاتا ہے۔

صبحِ کاذب کی ہوا میں درد تھا کتنا منیرؔ
ریل کی سیٹی بجی تو دل لہو سے بھر گیا

(۶) گیت نگاری: منیر نیازی نے غزل اور نظم کے ساتھ ساتھ خالص ہندوستانی صنفِ سخن گیت نگاری میں بھی اپنی ایک الگ پہچان اور انفرادیت قائم کی۔ انھوں نے گیت نگاری کے روایتی آہنگ کے ساتھ جدید آہنگ کو بھی برتا۔

جس نے مرے دل کو درد دیا
اُس شکل کو میں نے بھلایا نہیں

(۷) تحیر و تجسس: منیر نیازی کا کلام طلسم، تحیر، تجسس، آسیبیت اور خوف و ڈر کی کیفیات سے بھرا پڑا ہے۔ ان کیفیات کے بیان سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ ایسے مناظرِ قدرت سے خوف زدہ ہیں یا اُن کے اندر ڈر پایا جاتا ہے۔ بلکہ وہ تو فطرت کے ایسے مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

جس کے کالے سایوں میں ہے وحشی چیتوں کی آبادی
اس جنگل میں دیکھی میں نے لہو میں لتھڑی اک شہزادی

(۸) ہجرت کا کرب: وطن کی محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ آزادی کے بعد نقل مکانی نے ہجرت زدہ لوگوں پر جو اثرات مرتب کیے، وہ غزل کا مرکزی موضوع بن کر ابھرے۔ منیر نیازی نے بھی ہجرت کے دکھ کو پوری طرح محسوس کیا۔ منیر نیازی کی شاعری میں بعض اوقات خوف کی جو کیفیت ملتی ہے، وہ دراصل تقسیمِ ہند کے بعد کی ہجرت کا شاخسانہ ہے۔

تھی جس کی جستجو وہ حقیقت نہیں ملی
ان بستیوں میں ہم کو رفاقت نہیں ملی

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

احمد فراز

جدید غزل گو شعرا میں احمد فراز کا نام نمایاں ہے۔ آپ ۱۹۳۱ء میں خیبر پختون خوا کے قصبے نوشہرہ ضلع کوہاٹ میں پیدا ہوئے۔ اصل نام سید احمد شاہ تھا۔ ادبی تربیت ان کے والد اور پشاور کے ادبی ماحول نے کی۔ انھوں نے پشاور یونی ورسٹی سے پہلے فارسی اور پھر اردو میں ایم اے کیا۔ احمد ندیم قاسمی سے گہری دوستی اور فیض احمد فیض سے غیر معمولی قربت نے احمد فراز کی شاعری کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۷۴ء میں انھیں آدم جی ادبی ایوارڈ دیا گیا۔ انھیں "ہلالِ امتیاز" سے بھی نوازا گیا جسے انھوں نے کچھ عرصے بعد سیاسی وجوہات کی بنا پر واپس کر دیا۔ ان کا انتقال ۲۵ راگست ۲۰۰۸ء میں ہوا۔

آپ کی مختلف تخلیقات کے نام اس طرح ہیں: جاناں جاناں، خوابِ گل پریشاں ہے، غزل بہانہ کرو، دردِ آشوب، تنہا تنہا، نایافت، نابینا شہر میں آئینہ، بے آواز گلی کوچوں میں، پس انداز موسم، شب خون، بودلک، یہ سب میری آوازیں ہیں، میرے خواب ریزہ ریزہ، اے عشق جفا پیشہ۔

(۱) کلاسیکی ادبی روایت: احمد فراز اردو فارسی کی کلاسیکی ادبی روایت کے دلدادہ تھے۔ اردو فارسی کی کلاسیکی شاعری پر اُن کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے حافظ، خیام، بیدل، رومی، غالب اور اقبال کی زمینوں میں بہت سی غزلیں کہیں۔ ان کے یہاں غزل کی کلاسیکی روایت کی پاس داری موجود ہے۔ انھوں نے کلاسیکی شاعری کے فکر و فن سے خوب استفادہ کیا ہے۔

ویرانی میں بڑھ کر تھے بیاباں سے تو پھر کیوں　　شرمندہ کیا ہے در و دیوار نے میرے
کہ شاعری بھی تو جزوِ پیمبری ہے فراز　　سو رنجِ خلقِ خدا صورتِ پیمبر کھینچ

(۲) رومانویت: احمد فراز بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ عشق ان کی شاعری کا محور ہے۔ ایک مخصوص قسم کی عشقیہ و رومانوی شاعری ان کی شناخت بن چکی ہے۔ انھوں نے محبت کے موضوع کو ہر طرح سے برتنے کی کوشش کی ہے۔ کبھی جی جان سے محبت، کبھی محبت سے بے اعتنائی، کبھی لاشعوری طور پر محبت کی فکر سے انکار۔ گویا کہ وہ جگہ جگہ اپنی محبت کی معنویت کو پانے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ذکرِ جاناں سے ہی میری غزل آراستہ ہے　　ورنہ میں کون مرا شعر سے کیا واسطہ
جانکپر وا پھر کس کو ہو جب قاتل ہو یاروں سا　　باتیں ہوں دلداروں جیسی لہجہ ہو غم خواروں سا

(۳) سہلِ ممتنع: احمد فراز کے بہت سے اشعار سہلِ ممتنع کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ان اشعار میں بھرپور کشش محسوس ہوتی ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ کا استعمال کر کے نہایت سادہ لفظوں معنی خیز بات کہنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

تیری باتیں ہی سنانے آئے　　دوست بھی دل ہی دکھانے آئے
آج تک اپنی بے کلی کا سبب　　خود بھی جانا نہیں کہ تجھ سے کہیں

(۴) جدت: فراز کی غزلوں میں روایت کی پاسداری کے ساتھ جدت کا پہلو بھی شامل ہے۔ وہ غزل تو بظاہر کسی روایتی موضوع پر کہتے ہیں، لیکن ان کے اشعار جدت و ندرت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ لب و لہجے کے لحاظ سے ان کی غزلیں انفرادیت کی حامل ہیں۔

بجا کہ درد سری ہے یہ زندگی کرنا — مگر یہ بارِ امانت کوئی اتار تو دے
ہمیں بھی ضد ہے کہاں عمر بھر نبھانے کی — مگر وہ ترکِ تعلق کا اختیار تو دے

(۵) لفظوں کا استعاراتی استعمال: فراز کی شاعری کی مخصوص لفظیات ہیں۔ جن لفظوں کا علامتی و استعاراتی طور پر ان کی شاعری میں بکثرت ملتا ہے وہ ہیں: چاند، تنہائی، جام، بسمل، حباب، سمندر، چشم، تیغ، میان، مقتل، سنگ، خواب، گلاب، پیرہن اور قاصد وغیرہ۔ ان کے یہاں تاریخی پس منظر پر کہے گئے اشعار کی بہت بڑی تعداد ہے۔ فرہاد، منصور، عیسیٰ، موسیٰ، فرعون وغیرہ کا بھی ذکر استعاراتی پیرائے میں ان کی غزلوں میں دکھائی دیتا ہے۔

رات کیا سوئے کہ باقی عمر کی نیند اُڑ گئی — خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا
وہ جو بے ظرف تھے اب صاحبِ میخانہ ہوئے — اب یہ مشکل کوئی دستار سلامت دیکھوں

(۶) انقلابی و مزاحمتی رنگ: انھوں نے فوجی انقلاب کے بعد انقلابی و مزاحمتی شاعر کی حیثیت سے اپنی انفرادی حیثیت تسلیم کرائی۔ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ اس میں شدت بھی آتی گئی۔ نظم اور غزل دونوں ہی میں انھوں نے اپنے اس رجحان کا اظہار کیا۔ وہ ظلم و جبر کی عالمی طاقتوں اور آمریت کے جبر و استبداد کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کرتے رہے۔ ان کی لکھی نظم "محاصرہ" ایک انقلاب انگیز نظم ثابت ہوئی۔

میں تو لب کھول کے پابندِ سلاسل ٹھہرا — تیری بات اور ہے، تو صاحبِ محفل ٹھہرا
کس قدر آگ برستی ہے یہاں — خلق شبنم کو ترستی ہے یہاں

(۷) خوش آہنگی: تراکیب کی خوش آہنگی اور الفاظ کی مرصع سازی ان کی اہم خصوصیت ہے۔ انھوں نے غزل کی روایت کا احترام کرتے ہوئے اسے ایک نیا مزاج دیا جو آج کے انسان کے احساس سے قریب تر اور ہم آہنگ ہے۔ ان کا لہجہ اور آہنگ ہماری کلاسیکی روایت کے ساتھ اپنی انفرادیت اور تازگی کی بدولت بے حد مقبول ہوا۔ ان کی غزل کا ایک مخصوص رنگ و آہنگ ہے جو حسن و جمال کی ترجمانی کرتے ہوئے قاری کے دل میں اترتا جاتا ہے۔

ہم ایسے خانہ برانداز، کنجِ غربت میں — جو گھر نہیں تو تصاویر گھر کی دیکھتے ہیں
نہ کشتیاں ہیں، نہ ملاح ہیں، نہ دریا ہے — تمام ریگِ رواں ہے سبھی سراب فروش

(۸) انانیت: فراز بنیادی طور پر باغی طبیعت کے مالک تھے۔ سر جھکانا انھیں گوارا نہیں تھا۔ وہ حالات سے محض مادی منفعت یا کسی مفاد پرستی کے لیے سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتے۔ ان کی شاعرانہ انا کا اظہار جا بجا ان کے کلام میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

غنیم سے بھی عداوت نہیں حد مانگی — کہ ہار مان لی لیکن مدد نہیں مانگی
ہزار شکر کہ ہم اہلِ حرف زندہ نے — مجاورانِ ادب سے سند نہیں مانگی

(۹) ترقی پسندانہ خیالات: احمد فراز نے ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر اپنی شاعری میں مساوات، ہمدردی، امن و انسانیت کی قدروں کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ وہ فیض احمد فیض، علی سردار جعفری جیسے ترقی پسند شعرا سے متاثر تھے۔ ان کے کلام سے ان کا ذہن ترقی پسندی اور انقلاب انگیزی کی طرف مائل ہوا۔ انھوں نے خود کو انفرادیت کے بجائے اجتماع سے جوڑنے کی کوشش کی۔ ایک عرصہ دراز تک ترقی پسندوں کی فکر ان کے یہاں جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔

زندہ رہنے کی تمنا ہو تو ہو جاتے ہیں — فاختاؤں کے بھی کردار عقابوں والے
میرا قلم تو امانت مرے لہو کی ہے — میرا قلم تو ضمانت مرے ضمیر کی ہے

(۱۰) جدیدیت: سن ساٹھ کی دہائی میں شعرا کی بڑی تعداد جدیدیت سے متاثر ہوئی۔ اس تحریک سے وابستہ لوگ ایک نئے طرزِ احساس کے مالک تھے۔ جدیدیت کے رجحانات سے متاثر شعرا کے کلام میں زیادہ تر تنہائی، اداسی اور درد کا احساس جا بجا دکھائی دیتا ہے۔ جدیدیت کے پیروکاروں نے جدید شاعری میں صنعتی دور کے انسانوں کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ اس دور کا انسان ترقی کے منازل طے کر چکنے کے باوجود شخصی طور پر ایک بحران کا شکار ہے۔

اک فراز تمھیں تنہا ہو جواب تک دکھ کے رسیا ہو — ورنہ اکثر دل والوں نے درد کا رستہ چھوڑ دیا

(۱۱) موضوعاتی وسعت: موضوعاتی اعتبار سے فراز کی غزلیں اپنے اندر وسعت اور بالیدگی رکھتی ہیں۔ یہ موضوعات ان کے جذبات و احساسات کا پیکر ہیں جو صداقت پر مبنی ہیں۔ انھوں نے انسانی جذبات کے ساتھ ساتھ سماجی اور سیاسی موضوعات کی عکاسی شگفتہ اور شاداب لہجے میں کی ہے۔

اس ظلم میں، میں بھی شریک ہوں جیسے — میرا سکوت مجھے سخت مجرمانہ لگے
کسی کو گھر سے نکلتے ہی مل گئی منزل — کوئی ہماری طرح عمر بھر سفر میں رہا

(۱۲) غنائی کیفیت: غنائی کیفیت ان کی غزلوں کی اہم خصوصیت ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی قاری اسے گنگنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ان کی غزلوں میں ایک قسم کی چاشنی اور حلاوت محسوس ہوتی ہے اور اس انداز سے انھیں ایک انفرادی پہچان ملتی ہے۔

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ — آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ
روگ ایسے بھی غمِ یار سے لگ جاتے ہیں — در سے اٹھتے ہیں تو دیوار سے لگ جاتے ہیں

ناقدین کی آرا: شمیم حنفی کی رائے میں: "فیض کے بعد فراز کا نام اس حیثیت سے نمایاں ترین کہا جا سکتا ہے کہ ان کی بصیرتوں کا پس منظر ان کی ادبی روایات، اب تک سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی کلاسیکی قدروں کے ساتھ ساتھ ان کے زمانے کی اجتماعی زندگی اور ان کی تاریخ کو بھی ساتھ ساتھ مرتب کیا ہے"۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

قابل اجمیری

قابلؔ تخلص اور عبدالرحیم نام تھا۔ ۲۷/ اگست ۱۹۳۱ء کو قصبہ چرلی، ضلع اجمیر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دارالعلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر شریف سے علوم شرقیہ کی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں صحافت کو ذریعہ معاش بنایا۔ کچھ عرصہ عرائض نویسی (درخواستیں لکھنے کا پیشہ) اختیار کیا۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد سندھ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ زمانہ تعلیم ہی سے شعروشاعری کررہے تھے۔ وہ ارمان اجمیری اور عبدالباری معنی سے مشورہ سخن بھی کیا کرتے تھے۔ ۱۹۴۵ء سے قابل کی شاعری کا شعوری دور شروع ہوتا ہے۔ وہ ادب برائے زندگی پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ شاعری کے ذریعے وعظ و پند کے قائل نہیں۔ قابل کے اشعار، ان کے مزاج اور ان کی طرزِ فکر کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے کلام سے ان کی انفرادیت نمایاں ہے۔ خیالات اور جذبات کے ساتھ ساتھ ان کا اسلوب بیان بھی شگفتہ و پاکیزہ شعریت اور تغزل کا حامل ہے۔ مفلسی اور بیماری کی وجہ سے ۳۱ سال کی عمر میں ۳/ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو حیدرآباد میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے شعری مجموعے ''دیدۂ بیدار''، ''خون رگ جاں'' اور ''باقیات قابل'' شائع ہوئے۔ 'کلیات قابل' بھی شائع ہوگئی ہے۔ حکومت سندھ نے انھیں ''شاعرِ سندھ'' کے خطاب سے نوازا۔

۱۔ حسن وعشق: قابل اجمیری کے یہاں حسن عشق کے مختلف پہلو ملتے ہیں لیکن ان میں عمومیت کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ ایک مہذب اور باشعور انسان کی واردات وکیفیات کا پتہ دیتی ہیں۔ وہ نئی زندگی کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک نئے حالات میں احساسات کے زاویوں کو بھی بدلنا پڑتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

ہم نے دیے ہیں عشق کو تیور نئے نئے — ان سے بھی ہوگئے ہیں گریزاں کبھی کبھی
مقام عاشقی دنیا نے سمجھا ہی نہیں ورنہ — جہاں تک تیرا غم ہوتا وہیں تک زندگی ہوتی

۲۔ حقیقت کا احساس: قابل اجمیری کی شاعری میں صرف جذباتیت نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں حقیقت کا احساس بہت نمایاں ہے۔ وہ عشق اور معاملات وکیفیاتِ عشق کو سماجی پس منظر میں دیکھتے ہیں جو ان کے آس پاس اور گردوپیش میں موجود ہیں۔ ان کے یہاں محض رسمی اور روایتی انداز نہیں ہے بلکہ وہ خود ان حالات سے ہو کر گزرے ہیں:

اے گردشِ دوراں آ تجھ کو بھی اماں بخشیں — ہم نے غمِ جاناں کو سینے سے لگایا ہے
مقام عاشقی دنیا نے سمجھا ہی نہیں ورنہ — جہاں تک تیرا غم ہوتا وہیں تک زندگی ہوتی

۳۔ جولانی طبع: قابل اجمیری زندگی کی محرومیوں کو محسوس کرنے کے باوجود زندگی سے بیزار نہیں ہیں۔ آگے بڑھنے کا احساس ان کی شاعری میں بہت نمایاں ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ زندگی کے غم کو محسوس نہیں کرتے مگر ان کی جولانی طبع نے انھیں زندگی سے بیزار نہیں ہونے دیا، اسی لیے وہ کہتے ہیں:

ذوق سفر جوان ہے قابل بڑھے چلو — منزل بھی آج گردِ رہِ کارواں سہی
ہر قدم بھی حادثہ، ہر آرزو بھی حادثہ — حادثے پھر بھی ہمارے حوصلوں سے کم رہے

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

۴۔ امیجری: قابل کے اشعار میں زندگی کی متحرک تصاویر موجود ہیں اور ہر جذبہ میں وہ انسان کی عظمت اور اس کے احساس کی ندرت کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں مخصوص امیجری کا لطیف تخلیقی احساس موجود ہے:

شبِ فراق کی ظلمت دلوں تک آپہنچی — فروغِ جلوۂ جاناں کی بات کون کرے
کسی کو رنگ سے مطلب کسی کو خوشبو سے — گلوں کے چاک گریباں کی بات کون کرے

۵۔ جدت ولطافت: قابل اجمیری میں نکتہ سے نکتہ پیدا کر لینے، خیال روشن کر لینے اور روایت سے تازہ روایت کو جنم دینے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ ان کی طبیعت میں بلا کی جدت ولطافت اور ان کے احساس میں غضب کی تازگی وانفرادیت ہے، یہی سبب ہے کہ غزل کی بعض حد درجہ فرسودہ اور ناموافق زمینوں میں بھی وہ ایسے آبدار نشتر نکال لیتے ہیں:

یہی ہے دل کی ہلاکت یہی ہے عشق کی موت — نگاہِ دوست پہ اظہارِ بے کسی ہوجائے
زمانہ دوست ہے کس کس کو یاد رکھو گے — خدا کرے کہ تمھیں مجھ سے دشمنی ہوجائے

۶۔ صحت منداور مثبت نظریات: قابل اجمیری کی شاعری کسی فکر یا کسی مثالی تہذیب کی ترقی وفروغ کے لائحہ عمل سے وابستہ نہیں ہے لیکن ان کے یہاں وسیع تر انسانیت کے بارے میں سوچنے کا ایک نمایاں انداز نظر آتا ہے، وہ انسان کو ایک توانا اور محترم سماجی اکائی کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ قابل کی شاعری بھی صحت مند نظریات اور مثبت اقدار کی آئینہ دار ہے اگرچہ وہ خود ایک مہلک بیماری میں مبتلا تھے لیکن وہ بیمار فکر، بیمار تہذیب اور بیمار ادب سے بیزار تھے۔ ان کے یہاں امید وبیم کی کش مکش ضرور ملتی ہے لیکن اس میں فتح امید ہی کی ہوتی ہے:

ظلمتِ دیر و حرم سے کوئی مایوس نہ ہو — اک نئی صبح اُبھرنے کو ہے میخانے سے
ہم بدلتے ہیں رُخ ہواؤں کا — آئے دنیا ہمارے ساتھ چلے

۷۔ روایت کا گہرا شعور: قابل اجمیری کے ہاں روایت کا گہرا شعور ملتا ہے۔ انھوں نے کلاسیکی شاعری کا بغور مطالعہ کیا اور اسے حرزِ جاں بنالیا۔ وہ غزل کے مزاج سے آشنا تھے۔ ان کے ہاں روایتی مضامین بکثرت ہیں لیکن انھوں نے اپنی جدتِ طبع سے کام لیتے ہوئے روایت میں اضافہ کیا۔

کچھ ہو غمِ دوراں، غمِ جاناں تو نہ ہوگا — ہوجائے گا رُسوا، مگر ارزاں تو نہ ہوگا
جائیں گے تو مل جائیں گے ہمدرد بہت سے — زنداں ہی تو ہوگا درِ جاناں تو نہ ہوگا

۸۔ جبر کے خلاف آواز: قابل اجمیری نے ہمیشہ جبر کے خلاف آواز اٹھائی۔ یقینِ محکم اور عملِ پیہم کو بروئے کار لاتے ہوئے انھیں اس بات کا یقین ہے کہ ظلم کے خلاف حق کے راستے پر چلنے کے لیے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا ہوگی، جب ہی تو کہہ رہے ہیں:

کر رہا ہوں جہادِ زندگی — وقت میری داستاں ہے آج کل
ہم چراغِ یقیں جلاتے ہیں — وقت کو راستہ دکھاتے ہیں

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

۹۔ **زمانے کی بے رحمی:** قابل اجمیری کی شاعری میں زمانے کی بے رحمی کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔انھوں نے اس مضمون کو خالص ذاتی اور انفرادی سطح پر غم عشق سے جدا کر کے بھی دیکھا ہے۔ان کے دل میں زمانے کی بے رحمی ہے، لیکن انھیں اپنی بے سروسامانی کا بھی احساس ہے:

جب کسی موڑ پہ آتا ہے زمانہ قابلؔ　　زندگی مرحلۂ دار و رسن ہوتی ہے
حوادث ہمسفر اپنے، تلاطم ہم عناں اپنا　　زمانہ لوٹ سکتا ہے تو لوٹے کارواں اپنا

۱۰۔ **جدت اور انفرادیت:** قابل اجمیری کی طبیعت میں بلا کی جدت اور انفرادیت تھی۔انھوں نے نمایاں طور پر کسی شاعر کے اثرات قبول نہیں کیے۔وہ اپنا ذاتی اسلوب، آہنگ اور لہجہ تشکیل دینے میں مصروف رہتے تھے۔وہ ایک کامل مصور کی طرح مختلف رنگوں کے امتزاج سے ایک ایسی تصویر بناتے ہیں کہ دیکھنے والوں پر سحر طاری ہو جائے:

ہم بے کسوں کی بزم میں آئے گا اور کون　　آ بیٹھتی ہے گردشِ دوراں کبھی کبھی
رخِ حیات کی افسردگی نہیں جاتی　　نہ جانے کونسا غم تشنۂ بیاں ہے ابھی

۱۱۔ **مرصع سازی:** قابل اجمیری الفاظ کے تخلیقی استعمال سے آگاہ تھے۔انھیں الفاظ کے برتنے میں فنکارانہ قدرت حاصل تھی۔وہ الفاظ کی در و بست کا خاص خیال رکھتے تھے۔بقول آتش اس ہنرمندی کو مرصع سازی کا نام دیا جا سکتا ہے۔اس ہنرمندی کی وجہ سے ان کے کلام میں ایک خاص قسم کی سبک روی، نرمی اور تازگی پیدا ہو جاتی تھی:

رکا رکا سا تبسم، جھکی جھکی سی نظر　　تمھیں سلیقۂ بیگانگی کہاں ہے ابھی
جنم جنم کے اندھیروں کو دے رہا ہے شکست　　وہ اک چراغ کہ اپنے لہو سے روشن ہے

ناقدین کی آرا:

جگر مراد آبادی کے بقول: ”قابل پختہ مشق شاعر ہیں، وہ غزل کے مزاج کو سمجھتے ہیں اور اس کو برتنے کے آداب سے وہ پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں“۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے بقول: ”قابل لکیر کے فقیر نہیں۔ان کے ہاں تقلید کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔وہ نئی بات کہتے ہیں اور اپنے انداز میں کہتے ہیں“۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بقول: ”قابل اجمیری کی طبیعت کو غزل سے خاص مناسبت ہے۔وہ غزل کے مزاج خاص اور اس کے شعور کو سلیقے سے برتنے کی صلاحیت رکھتے ہیں“۔

شاہد احمد دہلوی کے بقول: ”خوش نصیب ہیں وہ شاعر جن کی کچھ غزلیں زندہ رہتی ہیں۔انھی خوش نصیبوں میں جن کی غزلیں دست برد زمانہ بچ رہی ہیں قابل اجمیری بھی ہیں“۔

شورش کاشمیری کے بقول: ”ان کے کلام سے ان کی انفرادیت ٹپکتی ہے، اسلوب بیان شگفتہ و پاکیزہ اور تغزل میں ڈوبا ہوا ہے۔وہ تقلید کے قائل نہیں۔نئی راہیں تراشتے اور نئے راستے ڈھونڈتے ہیں“۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

امجد حیدر آبادی

امجد حیدر آبادی کا اصل نام سید احمد حسین اور تخلص امجد تھا۔ آپ حیدر آباد دکن کے ایک صوفی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے۔ آپ اردو اور فارسی کے رباعی گو شاعر تھے۔ حکیم الشعرا کے نام سے بھی جانے جاتے تھے۔ تین برس کی عمر سے آپ کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ کاغذ، تختے اور در و دیوار پر مشق کیا کرتے۔ ابتدائی مکتب کی تعلیم کے بعد آپ مدرسہ نظامیہ میں داخل ہوئے مگر وہاں تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہا۔ گھر پر بھی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔ پنجاب یونی ورسٹی کے امتحانات منشی، منشی عالم اور منشی فاضل میں کامیاب ہوئے۔ بنگلور میں سرکاری مدرسہ میں ملازمت کی مگر کچھ عرصہ بعد ہی اسے ترک کر کے حیدر آباد دکن آ گئے اور یہاں مدرسہ دارالعلوم میں مدرسی کی خدمت انجام دیں۔ چند سال بعد دفتر صدر محاسبی میں منتقل ہو گئے۔ آپ کی قابل ذکر تصانیف میں "ریاض امجد"، "خرقہ امجد"، "نذرِ امجد"، "جمال امجد"، "حج امجد" اور "میاں بی بی کی کہانی" شامل ہیں۔

۱۔ **شاعری:** امجد حیدر آبادی کو پندرہ سال کی عمر سے شاعری کا شوق تھا۔ ناسخ کے دیوان کے مطالعہ سے اس شوق کی ابتدا ہوئی۔ آپ ایک صاحب باطن صوفی اور حقیقت نگار فطری شاعر تھے۔ آپ کی شاعری آپ کا پہلا اردو شعر:

نہیں غم گرچہ دشمن ہوگیا ہے آسماں اپنا مگر یارب، نہ ہو، نامہرباں وہ مہرباں اپنا

۲۔ **حال وقال:** آپ صوفی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے مگر آج کل کی طرح پیری مریدی نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی محنت سے روزی کماتے اور غریبوں کی دست گیری فرماتے۔ سادگی اور صفائی آپ کے جوہر ہیں۔ صاحب حال آپ کی اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ: "پایا مقام اُس کا موالی تیری گلی میں"۔

۳۔ **سادگی اور نازک خیالی:** آپ کی شاعری میں نازک خیالی کے ساتھ سادگی بھی تھی۔ آپ کا کلام نہایت صاف اور عام فہم ہوتا ہے۔ مشکل عربی اور فارسی الفاظ سے مملو نہیں ہوتا۔ صفائی اور سادگی سے جہاں آپ اپنا نظیر ہیں وہاں نازک خیالی اور لطیف تمثیلوں اور تشبیہوں سے چار چاند لگا دیتے ہیں:

کہو شعر ایسا جو ہو تیز خنجر ادھر منہ سے نکلا اُدھر دل میں اُترا

۴۔ **واقعہ نگاری:** واقعہ نگاری میں اس کلام کو داخل کیا جائے گا جو کسی واقعہ کا اظہار کرتا ہو۔ 28 ستمبر 1908 میں ایک سیلاب آیا تھا جس میں کئی دن مسلسل بارش کی وجہ سے تالاب کا بند ٹوٹ گیا اور سیلاب آ گیا۔ امجد نے اپنی نظم "قیامتِ صغریٰ" میں اس واقعے کی منظر نگاری کی ہے۔ امجد حیدر آبادی کی نظمیں "قتیلِ جفا"، "ایک بیکس کا خواب" وغیرہ اسی قسم کی نظمیں ہیں:

وہ رات کا سناٹا وہ گھنگھور گھٹائیں بارش کی لگاتار جھڑی سرد ہوائیں
گرنا وہ مکانوں کا وہ چیخوں کی صدائیں وہ مانگنا ہر ایک کا رو رو کے دعائیں
پانی کا وہ زور اور وہ دریا کی روانی پتھر کا کلیجہ ہو جسے دیکھ کے پانی

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

۵۔ وصف نگاری: وصف نگاری میں قدرت کے موجودات کی حقیقت اور حالت یا ان کے نمایاں اوصاف بیان کیے جاتے ہیں۔امجد حیدر آبادی کی نظمیں اس موضوع پر بھی ہیں۔آپ نے "میری قمری"، "ماں اور بچی"، "یتیم کی دعا" وغیرہ جیسی نظمیں لکھی ہیں:

قمریاں یوں تو دیکھی بھالی ہیں — اس کی باتیں مگر نرالی ہیں
گیت توحید کا سُناتی ہے — راہِ حق کی طرف بلاتی ہے

۶۔صوفیانہ نظمیں: تصوف امجد حیدر آبادی کا خاص موضوع ہے۔آپ خود بھی ایک بلند مرتبہ صوفی تھے۔آپ کا کلام قال نہیں بلکہ حال ہوتا ہے۔حالتِ کیف میں جو کچھ گزرتا اور نظر آتا ہے وہی زبان اور قلم سے نکلتا ہے۔آپ کی بعض نظموں کے عنوان "صدائے درویش"، "عاشق کا جنازہ"، "مجلس سماع"، "پیٹ کا ظلم"، "کوئلہ بھئی نہ راکھ" وغیرہ ہیں۔امجد حیدر آبادی نے بعض نظموں کے عنوان قرآن شریف کی کسی آیت پر رکھے ہیں۔مثلاً: **اقیموالصلوٰۃ۔ ماعبدناك حق عبادتك۔ بین الخوف والرجاء** وغیرہ۔

عمر اک دن ہو کہ سو سال گزر جاتی ہے — دوش پر کملی ہو یا شال گزر جاتی ہے
گو امیروں کی بہ اقبال گزر جاتی ہے — بیکسوں کی بھی بہرحال گزر جاتی ہے

۷۔ فلسفہ: رباعی ایک ایسی شاعری ہے جس میں فلسفیانہ نکتے بھی بیان کیے جاتے ہیں۔اردو شاعری میں ایسے بہت کم شاعر ہیں جنھوں نے فلسفہ پر گفتگو کی ہے۔غالبؔ کا کلام تو تمام تر فلسفہ ہی کہا جاتا ہے مگر امجد حیدر آبادی کے یہاں بھی فلسفیانہ انداز موجود ہے۔ملاحظہ ہو:

اچھا نہیں یہ غرور جلدی کیجے — حتی الامکان ضرور جلدی کیجے
ہر سانس یہ کہہ رہی ہے آتے جاتے — چلنے کے لیے حضور جلدی کیجے

درجِ بالا رباعی میں بتایا گیا ہے کہ انسان کا جسم ایک چھوٹی دنیا ہے جس میں سینکڑوں کل پُرزے کام کرتے ہیں۔انسان کی زندگی ایک گھڑی ہے جو چلتی رہتی ہے۔انسان کی سانس ہی ایک ایسی رفتار ہے جس پر زندگی کا دارومدار ہے۔

۸۔رباعیات: اردو شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی اور اس میں مثنوی کے ساتھ رباعی بھی نظر آتی ہے۔یہ مبالغہ نہیں ہے کہ امجد حیدر آبادی رباعی کے بادشاہ ہیں۔آپ کی رباعیاں حقائق و معارف تصوف، اخلاق اور فلسفہ وغیرہ پر مبنی ہیں۔رباعی ملاحظہ ہو جس میں امجد حیدر آبادی قرآن کی آیت **اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ** کے ذریعے سوال کرنے کی مذمت اور صرف خدا ہی سے طلب کرنے کی ہدایت یوں کرتے ہیں:

ہر چیز مسبب سبب سے مانگو — منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو — بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

امجد حیدر آبادی کے کلام میں میرؔ کا سا درد اور سوز و گداز ہے، خواجہ میر دردؔ کا سا تصوف اور غالبؔ جیسا فلسفہ موجود ہے۔آپ کے کلام سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ آپ کا کلام جہاں سراپا سوز و گداز، درد و الم سے بھرا ہوا ہے وہاں اخلاق اور فلسفہ کے گران قدر نکتوں اور تصوف کے بیش بہا نگینوں سے جڑا ہوا ہے۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

انور مسعود

نام محمد انور مسعود اور تخلص انور ہے۔ ۸ نومبر ۱۹۳۵ء کو کنجاہ گجرات (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں ایم اے (فارسی) کرنے کے بعد تدریس کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔ گورنمنٹ کالج راولپنڈی میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز رہے۔ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ طنز و مزاح کے شاعر ہیں، مگر منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے سنجیدہ مضامین میں بھی شاعری کرتے ہیں۔ ان کی تمام طنزیہ و مزاحیہ شاعری قطعہ کی صورت میں ہے۔ ان کا مزاج بچپن ہی سے ظریفانہ اور شاعرانہ تھا۔ بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور مزاح ان کی طبیعت کا خاص جز دتھے۔ یہی وجہ ہے کہ سنجیدہ شاعری کے مقابلے میں ان کے طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے مجموعوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ان کی تصانیف میں: 'میلہ اکھیاں دا' (پنجابی)، ''قطعہ کلامی'' (مجموعہ قطعات)، 'اک دریچہ اک چراغ'، 'میلی میلی دھوپ'، 'غنچہ پھر لگا کھلنے'، 'تقریب' (مجموعہ مضامین) وغیرہ شامل ہیں۔

۱۔ **خوش گوار لطافت:** انور مسعود کے یہاں ہمیں خوش گوار لطافت کا احساس ملتا ہے۔ اُن کی شاعری ایسی قوس وقزح کی مانند ہے جس کی دھنک سوئے ہوئے ذہنوں کو بیدار کرتی ہے، اور بھٹکے ہوئے ذہنوں کو تحریک دیتی ہے۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ وہ ایسے خنجر چلاتے ہیں کہ خنجر بھی چلے اور سر بھی سلامت رہے۔

انور کی سر بزمِ سخن آئی ہے باری — کیا جانیے یہ شخص ہنسا دے کہ رُلا دے

۲۔ **تحریف، تضمین اور پیروڈی:** انور مسعود کی نظر سے زندگی کا کوئی پہلو نہیں بچتا۔ ان کا مزاح، وسیع مطالعہ کی وجہ سے تحریف، تضمین اور پیروڈی میں برجستگی پیدا کر دیتا ہے۔

دل کی بیماری کے اک ماہر سے پوچھا میں نے کل — یہ مرض لگتا ہے کیوں کر آدمی کی جان کو
ڈاکٹر صاحب نے فرمایا توقف کے بغیر — "دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو"

۳۔ **سماجی اور تہذیبی شعور:** انور مسعود کے یہاں سماجی ناہمواری اور ناانصافی کے خلاف طنز و مزاح کے ذریعے ان چیزوں کو ہدف بنایا جاتا ہے جو ناپسندیدہ ہوں۔ انور مسعود ان ناانصافی اور ناہمواری کو دیکھ کر افسوس کرتے ہیں اور ان لوگوں سے ہمدردی کرتے ہیں جو ان ناانصافیوں کا شکار ہوتے ہیں:

کوئی ہو جائے مسلمان تو ڈر لگتا ہے — مولوی پھر نہ بنا دے اسے کافر بابا

۴۔ **طنز کی چبھن کو مزاح میں ڈھانپنا:** انور مسعود طنز کی چبھن کو مزاح کے ذریعے ڈھانپنے میں بھرپور طریقے سے کامیاب رہتے ہیں۔ وہ اپنا بات کا اظہار کرتے ہیں مگر اس انداز میں کہ مزاح ہی کے ذریعے مخاطب کو پیغام پہنچ جائے:

شیرینی مزاح میں اس کو لپیٹ کر — انور نے طنز کو بھی گوارا بنا دیا

۵۔ **قطعہ نگاری:** انور مسعود مزاح کے میدان میں قطعہ نگاری میں بھی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ انور مسعود کے قطعات میں فنی

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

روایت کا رچاؤ اور زبان و بیان کی سجاوٹ ملتی ہے۔ ان کے طنز کی دھار اتنی تیز ہوتی ہے کہ جس کے گلے پر پھرتی ہے اُسے بھی مزہ آتا ہے:

واپڈا والوں سے کہنا چاہیے　　کم سے کم اتنا کرم تو کیجیے
زلزلے کے بے اماں جھٹکوں کے بعد　　ہم کو بجلی کے نہ جھٹکے دیجیے

۶۔ **مغربی تہذیب وتمدن پر طنز:** انور مسعود ایسے مغربی تہذیب کے دلدادہ نوجوانوں پر طنز کرتے ہیں جنھیں مشرقی ثقافت اور تہذیب وتمدن سے کوئی دلچسپی نہیں:

جیے جاتے ہیں جیسے اہل یورپ　　اسی انداز سے تو بھی جیے جا
یہی ہے اب جدیدیت کا مطلب　　کہ بس مغرب کی نقالی کیے جا

۷۔ **ذاتیت سے اجتناب:** انور مسعود کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی کی ذات کو نشانہ نہیں بناتے بلکہ سرسری نشان دہی کر کے گزر جاتے ہیں:

کس ناز سے وہ نظم کو کہہ دیتے ہیں نثری　　جب اس کے خطا ہوتے ہیں اوزان وغیرہ
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں　　گھوڑوں کی طرح بکتے ہیں انسان وغیرہ

۸۔ **منفرد اسلوب:** انور مسعود کا اسلوب منفرد ہے جو ان کے قطعات میں خاص طور پر نمایاں ہے۔ وہ اپنے تخیل سے مشاہدے کی وسعت اور اپنی مخصوص لفظیات سے معانی ومطالب کے خوب صورت مجسمے تراشتے ہیں:

نرسری کا داخلہ بھی سرسری مت جانیے　　آپ کے بچے کو افلاطون ہونا چاہیے
دوستو انگلش ضروری ہے ہماری واسطے　　فیل ہونے کو بھی اک مضمون ہونا چاہیے

ناقدین کی آرا:

بقول سیّد ضمیر جعفری: آج ہمارے ملک میں شاید چند ہی ایسے شعراء موجود ہوں جو فارسی، اردو اور پنجابی تین زبانوں میں ان کی سی قدرت ومنزلت رکھتے ہوں۔ وہ ایک ممتاز و مشہور شاعر ہی نہیں بے حد محبوب ومقبول شاعر بھی ہیں۔

بقول مشتاق احمد یوسفی: انور مسعود تحریف، تضمین اور پیروڈی ایسی فن کارانہ مہارت سے کرتے ہیں کہ اصل کو بھی اپنا ہی کرشمۂ کلام بنا کر دکھا دیتے ہیں۔

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

اصنافِ ادب کی تعریفیں

نظم

نظم کے لغوی معنی ہیں۔موتیوں کو دھاگے میں پرونا۔چوں کہ نظم میں بھی لفظ موتیوں کی طرح پروئے جاتے ہیں۔شاعری کی اصطلاح میں نظم اس کلام موزوں کو کہتے ہیں جو باوزن ہو، ردیف وقافیہ سے مزین ہو اور بالارادہ کہا جائے نظیر اکبر آبادی، حالی، اقبال اور دیگر شعرا نے نظمیں کے میدان میں بہت کام کیا۔نظم کی اقسام باعتبار تقسیم عروض۔(۱) غزل (۲) قصیدہ (۳) مثنوی (۴) قطعہ (۵) رباعی۔

حمد

حمد کے معنی اللہ تعالیٰ کی تعریف کے ہیں۔اصطلاح میں حمد وہ نظم ہوتی ہے جس میں باری تعالیٰ کی صفات اور عظمت وقدرت کا بیان ہوتا ہے اور مختلف پہلوؤں سے تعریف کی جاتی ہے۔حمد میں جذبات کی پاکیزگی اور زبان کی شائستگی کا بے حد خیال رکھا جاتا ہے۔حمد کے شعر ملاحظہ ہوں:

کوئی تو ہے جو نظامِ ہستی چلا رہا ہے، وہی خدا ہے　　جو دن کو رات اور، رات کو دن بنا رہا ہے، وہی خدا ہے

☆☆

وہی ہے پروردگار سب کا، وہی ہے ارض و سما کا خالق　　اسی سے ہے ارتقا کا ساماں، اسی سے فیضان ہے نمو کا

نعت

نعت وہ صنفِ نظم ہے جس میں رسولِ پاک ﷺ کی ذات، صفات اور اخلاق کا بیان ہوتا ہے۔نعت درحقیقت ایک مسلمان کی آنحضور ﷺ کی ذاتِ اقدس سے والہانہ عقیدت ومحبت کے اظہار کی ایک شکل ہے۔امیر مینائی، محسن کاکوروی، حفیظ تائب، مظفر وارثی، ماہر القادری نعت کے اہم شاعر ہیں۔نعت کے شعر ملاحظہ ہوں:

ایک بے نام کو اعزازِ نسب مل جائے　　کاش! مداحِ پیمبر کا لقب مل جائے

☆☆

ایسا کوئی محبوب، نہ ہوگا، نہ کہیں ہے　　بیٹھا ہے چٹائی پہ، مگر عرش نشیں ہے

مثنوی

مثنوی کا لفظ "مثنیٰ" سے بنا ہے اور مثنیٰ کے معنی دو کے ہیں۔اصطلاح میں ایسی صنف سخن کو کہتے ہیں، جس کے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور ہر دوسرے شعر میں قافیہ بدل جائے۔مثنوی میں لمبے لمبے قصے بیان کیے جاتے ہیں۔نثر میں جو کام ایک ناول سے لیا جاتا

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

ہے، شاعری میں وہی کام مثنوی سے لیا جاتا ہے۔ یعنی دونوں ہی کہانی بیان کرتے ہیں۔ مثنوی ایران سے ہندوستان میں آئی اردو مثنوی کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ اردو کی پہلی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ہے جس کو فخر دین نظامی نے تحریر کیا ہے۔ میر تقی میر، میر حسن، دیا شنکر نسیم وغیرہ نے بھی مثنوی لکھی ہیں۔

مرثیہ

مرثیہ عربی لفظ رثا سے مشتق ہے۔ جس کے لغوی معنی مُردے پر رونا اور اس کی تعریف کرنا ہیں۔ لیکن اصطلاحِ شعر میں مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں مرنے والے کی اخلاقی خوبیوں کا ذکر کر کے اس کی یاد میں اظہارِ غم کیا جاتا ہے۔ مرثیے کی صنف عربی سے فارسی اور فارسی سے اردو میں آئی۔ اردو کا سب سے پہلا مرثیہ نگار دکنی شاعر اشرف بیابانی تھا۔ میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، سوداؔ، میرؔ، حالیؔ، جوشؔ وغیرہ نے مرثیے بھی لکھے۔ مرثیے کی ہیئت (مسدس) ہے۔ مرثیے کے اجزا: (۱) تمہید (یعنی چہرہ) (۲) سراپا (۳) واقعات (۴) شہادت (۵) بین (۶) دعائیہ اشعار۔

آزاد نظم

آزاد نظم کو انگریزی میں (free verse) کہتے ہیں اور یہ پہلی مرتبہ فرانس میں غیر مساوی مصرعوں پر لکھی گئی ایک نظم تھی۔ اردو میں آزاد نظم میں بھی عروض کی پابندی کی جاتی ہے مگر اس کو قافیہ و ردیف سے آزاد رکھا جاتا ہے۔ میرا جی، ن۔م۔ راشد، فیض احمد فیض، سردار جعفری، اختر الایمان، افتخار عارف اور پروین شاکر آزاد نظم کے قابلِ ذکر شاعر ہیں۔

غزل

غزل کے لفظی معنی ہرن کے بچہ کے ہیں۔ غزل ہرن کی اس دردناک آواز کو کہتے ہیں جو وہ اس وقت نکالتا ہے جب شکاری کتے اسے دبوچنے والے ہوتے ہیں اور اس کے سینگ جھاڑی میں پھنس جاتے ہیں۔ غزل کے لغوی معنی ہیں۔ (سخن زنانِ گفتن) یعنی عورتوں سے بات چیت کرنا، عشق و محبت کی باتیں کرنا۔ لیکن شاعری کی اصطلاح میں غزل جس میں محبوب اور عورتوں سے عشق و محبت ہی کی باتیں کی جائیں اور ضمناً اِدھر اُدھر کی بھی کر لی جائیں۔ مگر اس میں قافیہ اور ردیف کی قید ضرور ہو۔ غزل میں کم از کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ سترہ شعر ہوتے ہیں۔ مگر اساتذہ نے سترہ اشعار سے زیادہ بھی کہے ہیں۔ غزل کا پہلا شعر مطلع اور آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے مقطع کہلاتا ہے۔ عام طور پر امیر خسرو کو اردو کا پہلا شاعر کہا جاتا ہے۔

پتہ پتہ، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے　　　جانے نہ جانے، گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے

☆☆

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے　　　ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

رباعی

شعری اصطلاح میں رباعی عربی لفظ ربع سے ہے جس کا مطلب چار ہے۔اوزان کی مختلف کتابوں میں رباعی کے مختلف نام ہیں۔ رباعی۔ ترانہ دوبیتی۔ چہارمصری۔ جفتی۔ رباعی اس صنف کا نام ہے جس میں چار مصرعوں میں ایک مکمل مضمون ادا کیا جاتا ہے۔ یعنی جامع سے جامع مضمون کو بہت خوبصورتی سے مکمل کر کے دریا کو کوزے میں بند کیا جاتا ہے۔ رباعی میں پہلا۔ دوسرا اور چوتھا مصرعہ (ہم ردیف) ہم قافیہ ہوتا ہے جبکہ تیسرا مصرعہ اس قید سے آزاد ہوتا ہے۔ غزل کی طرح رُباعی بھی مُرَدّف اور غیر مردّف ہو سکتی ہے خواہ قافیہ لائیں یا قافیہ ردیف دونوں۔ رباعی کی خوبصورتی کا دارومدار چوتھے مصرعہ پر ہوتا ہے جس کے حسن اور برجستگی سے پہلے تین مصرعوں کو بھی چار چاند لگ جاتے ہیں۔ رباعی صرف بحر حزج ہی میں لکھی جاتی ہے۔ اس کے لیے چوبیس اوزان مخصوص ہیں۔ اہلِ عروض نے اس بات کو جائز رکھا ہے کہ رباعی کا کوئی بھی مصرعہ ان چوبیس اوزان میں سے کسی وزن پر بھی ہو سکتا ہے۔

قطعہ

قطعہ کے لُغوی معنی ٹکڑے کے ہیں۔ اس میں مطلع کا ہونا ضروری نہیں۔ غزل اور قصیدے کی طرح اس کے تمام شعر قافیہ اور ردیف دونوں کے پابند ہوتے ہیں۔ اگرچہ عموماً قطعہ کے دو شعر یا چار مصرعے ہوتے ہیں، مگر اس کے شعروں کی تعداد مقرر نہیں۔ مضمون مسلسل ہوتا ہے۔ زمانہ جدید کے شعرا قطعہ میں مطلع بھی لکھنے لگے ہیں۔ میر، سودا، کے علاوہ دیگر شعرا نے بھی قطعات تحریر کیے ہیں۔ بعد میں مرزا غالب اور حالی نے اس کی طرف توجہ دی اور اسے ایک مستقل صنف بنا دیا۔

مضمون

مضمون ایک ایسی نثری تحریر کو کہتے ہیں جس میں لکھنے والا کسی ایک موضوع کے متعلق اپنی معلومات کے مطابق اظہار خیال کرتا ہے۔ مضمون میں ایک شگفتگی اور دلچسپی کا ہونا ضروری ہے۔ مضمون کو انگریزی میں Essay کہتے ہیں۔ ہر زبان کے ادب میں مضمون نویسی کا درجہ بہت بلند ہے اور تنقیدی اعتبار سے اس کی تعریف، اقسام اور خصوصیات کے سلسلے میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ مضمون کسی طالب علم کی قوت تحریر کا نتیجہ ہوتا ہے جس میں وہ کسی شخص، چیز یا واقعہ یا حقیقت پر مبنی اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اردو کے پہلے مضمون نگار سرسید احمد خان تھے۔ انھوں نے اپنے رسالے "تہذیب الاخلاق" کے ذریعے مضمون نویسی کے فروغ میں بڑا کردار ادا کیا۔

ڈراما

ڈراما یونانی صنف ادب ہے۔ یہ لفظ "ڈراؤ" سے نکلا ہے جس کے معنی "کر کے دکھانا ہے۔" قدیم زمانے میں یونانی اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے ڈراما کھیلا کرتے تھے، مگر بعد میں ڈراما ترقی کرتا ہوا موجودہ صورت تک پہنچ گیا اور اس میں مذہبی باتوں کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کے سب ہی پہلو شامل ہو چکے ہیں۔ اردو کا پہلا ڈراما 'اندر سبھا' ہے جس کو امانت حسن لکھنوی نے تحریر کیا ہے۔ اجزاء:
(۱) پلاٹ (۲) کردار (۳) عمل (۴) مکالمہ (۵) زمان ومکان (۶) خود کلامی (۷) زبان و بیان۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

ناول

ناول اطالوی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں انوکھا، نرالا اور عجیب۔ اصطلاح میں ناول وہ قصہ یا کہانی ہوتی ہے، جس کا موضوع انسانی زندگی ہوتا ہے۔ ناول میں ناول نگار زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مکمل اور گہرا مشاہدہ کرنے کے بعد انھیں ایک خاص سلیقہ سے کہانی کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ ناول افسانے کے مقابلے میں طویل اور اس کی بنیاد حقیقت نگاری پر مبنی ہوتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول "مراۃ العروس" کو اُردو کا پہلا ناول کہا گیا ہے۔ اُردو کے مشہور ناولوں کے نام یہ ہیں: فسانہ آزاد، ابن الوقت، امراؤ جان ادا، آنگن، آگ کا دریا، اُداس نسلیں، خدا کی بستی۔ ناول کے اجزائے ترکیبی درج ذیل ہیں:

(۱) پلاٹ (۲) مکالمہ (۳) کردار (۴) منظر نگاری (۵) مقصد (۶) زبان و بیان۔

افسانہ

افسانہ کے لغوی معنی داستان، قصہ یا چھوٹی کہانی کے ہیں۔ یہ ایک قسم کی فرضی کہانی ہوتی ہے جو زندگی کے کسی ایک پہلو پر روشنی ڈالتی ہے۔ افسانہ اس مختصر کہانی کو کہتے ہیں جس میں در حقیقت زندگی کے کسی ایک واقعہ یا پہلو کو دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہو، یہ ایک ہی نشست میں پڑھا جا سکے، اور اس میں وحدتِ تاثر بھی موجود ہو۔ ادب میں داستان کے بعد ناول آیا اور جب صنعتی انقلاب کے سبب لوگوں کی زندگی اور بھی زیادہ مصروف ہوگئی تو انیسویں صدی میں مختصر افسانہ سامنے آیا۔ اردو کے پہلے افسانہ نویس منشی پریم چند ہیں۔ اُن کا پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" تھا۔ انھوں نے اپنے افسانے میں معاشرے کی اصلاح کی کوشش کے ساتھ ساتھ امیر و غریب کی طبقاتی کشمکش بھی پیش کی ہے۔ افسانے کے اجزائے ترکیبی: (۱) پلاٹ (۲) کردار (۳) حقیقت نگاری (۴) مکالمہ نگاری (۵) زبان و بیان۔

خطوط نگاری

ہم ایک شخص سے کوئی بات کہنا چاہیں اور وہ ہمارے سامنے موجود نہ ہو، تو اپنی بات اور گفتگو اُسے لکھ بھیجنا خط نویسی کہلاتا ہے۔ خط کو عام طور پر نصف ملاقات کہا جاتا ہے۔ خطوط میں ذاتی خیالات کے علاوہ دل کی ترجمانی بھی ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق کے مطابق خطوں سے انسانی سیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اُردو میں ابتداً خطوط نگاری مشکل پسندی، تکلف اور عبارت آرائی کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ غالب نے اپنے خطوط میں سادگی، بے ساختگی اور شگفتگی کی بنیاد رکھی۔ ان شعرا و ادبا کے خطوط کو اُردو ادب میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ مرزا غالب، مولانا حالی، شبلی نعمانی، علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی، وغیرہ۔

سفرنامہ

سفر کی روداد کو قلمبند کر کے پیش کرنا سفرنامہ کہلاتا ہے۔ سفرنامہ ایک افسانہ کی طرح عمدہ اور دلچسپ صنف ادب بن سکتا ہے، اگر اس میں واقعات کی ندرت وجدت اور اندازِ بیان کی تازگی کا خیال رکھا جائے۔ "عجائباتِ فرنگ" اُردو کا پہلا سفرنامہ ہے۔ بیگم اختر ریاض الدین، شورش کاشمیری، جمیل الدین عالی، ممتاز مفتی، ابن انشا، مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں کو ادب میں خاص اہمیت حاصل ہے۔

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

شعری اصطلاحات

قافیہ:

قافیہ کے لفظی معنی "پیچھے چلنے والا" اور "پے در پے آنے والا" کے ہیں لیکن شاعری کی اصطلاح میں ملتی جلتی آواز والے الفاظ کو قافیہ کہتے ہیں۔ یہ مطلع کے دونوں مصرعوں میں اور باقی اشعار کے صرف دوسرے مصرعے میں ہوتا ہے۔

قافیہ عام طور پر ردیف سے پہلے ہوتا ہے۔

مثال ۱: آگہی میں اک خلا موجود ہے　　اس کا مطلب ہے خدا موجود ہے

اس شعر میں "خلا" اور "خدا" قافیے ہیں۔

مثال ۲: خدایا اول و آخر بھی تو ہے　　خدایا باطن و ظاہر بھی تو ہے

اس شعر میں "آخر" اور "ظاہر" قافیے ہیں۔

ردیف:

ردیف کے لفظی معنی "گھڑسوار کے پیچھے بیٹھنے والا شخص" کے ہیں لیکن شاعری کی اصطلاح میں وہ لفظ یا الفاظ جو قافیے کے بعد آئیں ردیف کہلاتے ہیں۔ ردیف مطلع کے دونوں مصرعوں میں اور باقی اشعار کے صرف دوسرے مصرعے میں ہوتی ہے۔ یہ قافیے کی طرح ضروری تو نہیں ہے لیکن اکثر استعمال ہوتی ہے۔

مثال ۱: حضورؐ ایسا کوئی انتظام ہو جائے　　سلام کے لیے حاضر غلام ہو جائے

اس شعر میں "ہو جائے" ردیف ہے۔

مثال ۲: مدینے کو جائیں یہ جی چاہتا ہے　　مقدر بنائیں یہ جی چاہتا ہے

اس شعر میں "یہ جی چاہتا ہے" ردیف ہے۔

مطلع:

مطلع کے معنی "طلوع ہونے کی جگہ" کے ہیں لیکن شاعری کی اصطلاح میں غزل یا قصیدے کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے۔ جس کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے اور اگر ردیف ہو تو وہ بھی دونوں مصرعوں میں ہوتی ہے۔

مثال ۱: دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا　　وہ تیری یاد تھی اب یاد آیا

شعر کے دونوں مصرعوں میں "سبب" اور "اب" قافیے موجود ہیں اور "یاد آیا" ردیف ہے وہ بھی دونوں مصرعوں میں ہے۔

مثال ۲: مسلسل بے کلی دل کو رہی ہے　　مگر جینے کی صورت تو رہی ہے

اس شعر میں "کو" اور "تو" قافیے ہیں جو دونوں مصرعوں میں موجود ہیں اور "رہی ہے" ردیف وہ بھی دونوں مصرعوں میں شامل ہے۔

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

مقطع:

مقطع کے معنی "کاٹنے یا اختتام کرنے کے ہیں" لیکن شاعری کی اصطلاح میں غزل یا قصیدے کا آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص بھی استعمال کرے مقطع کہلاتا ہے۔

مثال ۱: فیض زندہ رہیں وہ ہیں تو سہی — کیا ہوگر وفا شعار نہیں

اس شعر میں فیض احمد فیض نے اپنا تخلص فیض استعمال کیا ہے۔

مثال ۲: اے عدم احتیاط لوگوں سے — لوگ منکر نکیر ہوتے ہیں

اس شعر میں عبدالحمید عدم نے اپنا تخلص عدم استعمال کیا ہے۔

تضاد یا صنعت تضاد:

تضاد کے معنی برعکس یا الٹ کے ہیں لیکن شاعری کی اصطلاح میں یہ ایک ایسی صفت ہے جس میں شعر میں متضاد معنوں والے الفاظ جمع کیے جاتے ہیں۔

مثال ۱: رات دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اس شعر میں "رات" اور "دن" متضاد الفاظ ہیں۔

مثال ۲: آتے آتے آئے گا اُن کا خیال — جاتے جاتے بے خیالی جائے گی

اس شعر میں آتے اور جاتے، آئے اور جائے اور خیال اور بے خیالی متضاد الفاظ ہیں۔

تلمیح یا صنعت تلمیح:

تلمیح کے معنی اشارہ کرنا یا نگاہ ڈالنے کے ہیں۔ لیکن شاعری کی اصطلاح میں جب شاعر اپنے شعر میں قرآن کی آیت، حدیث، مشہور قول، کسی اور فن کی اصطلاح یا کسی تاریخی واقعے کی طرف اشارہ کرے تو اسے تلمیح کہتے ہیں۔

مثال ۱: جلتے ہیں جبرئیلؑ کے پَر جس مقام پر — اس کی حقیقتوں کے شناسا تمھی تو ہو

اس شعر میں واقعہ معراج کی طرف اشارہ ہے۔

مثال ۲: کچے گھڑے نے جیت لی ندی چڑھی ہوئی — مضبوط کشتیوں کو کنارہ نہیں ملا

اس شعر میں "سوہنی مہینوال" کی رومانوی داستان کی طرف اشارہ کیا ہے۔